عقل و عشق
مصنفہ
عبداللہ الاثری
مکتبہ
دین و دنیا
لاہور

عقل و عشق

ترجمانِ حقیقت کی نظر میں

از

ابو الخیال عبداللہ الاثری

سابق مدیر اعلیٰ روزنامہ زمیندار لاہور

مکتبہ دین و دنیا (رجسٹرڈ) سرکلر روڈ نزد چوک اردو بازار [illegible]

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 031932
★ MAILSI ★

نقشِ اول ۱۰۰۰
قیمت :- ۱۲ر

ناشر :- مکتبۂ دین و دنیا (رجسٹرڈ) لاہور
مطبوعہ :- رحمانی پریس - ذیلدار روڈ لاہور

انتساب

میں اپنی اس ناچیز کوشش کو ترجمان حقیقت
علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے
مرقدِ منور پہ نچھاور کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

نیاز کیش :-

عبداللہ الاثری

سابق مدیر اعلیٰ رسالہ ماہنامہ حقیقت لاہور

فہرست مضامین

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور

چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

(اقبالؒ)

فلسفۂ عقل و عشق

ترجمانِ حقیقت کی نظر میں

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل
فاطرِ ازل نے، اپنے تخلیقی شاہکار کو حاملِ بارِ امانت بنانے، اسے اشیائے عالم سے منشائے قدرت کے مطابق کام لینے کی صلاحیت بخشنے اور دوسری تمام مخلوقات پر شرف و مجد کا اعزاز عطا کرنے کی غرض سے جو مابہ الامتیاز فضیلت، جو قابلِ فخر برتری اور جو عدیم النظیر فوقیت اس کے جسدِ خاکی میں ودیعت فرمائی، ہماری اصطلاح میں اس کا نام عقل ہے۔ یہ وہ جوہرِ قابل ہے جو انسان کو دوسری جاندار مخلوق اور جمادات سے ممیز کرتا ہے اور جس کے ذریعہ سے ہم کائنات کی ہر شے کی ماہیت، خواص، اثرات اور ان سے کام لینے کا علم و شعور حاصل کرتے ہیں۔ ہم دوشِ ہوا پر اڑتے ہیں، امواجِ بحر پر تیرتے اور اس کے آغوش سے لعل و گوہر کے خزانے نکالتے ہیں، آگ اور پانی میں نمدگی ایسی حرارت پیدا کر کے اس سے اپنی سیاسی و مدنی اور معاشی و اقتصادی ضروریات کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں، برق و باد کی امداد سے ستاروں کی ناقابلِ فہم رفعتوں اور لاکھوں فرسخ پر بسنے والے انسانوں

سے گویا بالمشافہ گفتگو کرتے ہیں۔ الغرض اس عقل کی بدولت ہم ارض و سما کا گوشہ گوشہ ٹٹولتے اور ذرہ ذرہ مسخر کرتے ہیں اور پھر یہ قوت فائقہ ہم پر صرف علوم الاشیاء ہی کے دروازے نہیں کھولتی بلکہ ہمارے اندر اپنی حرکات و سکنات اور قول و فعل کے حسن و قبح کو جانچنے کا بھی شعور پیدا کرتی ہے اور حیاتِ انسانی کی منزلِ مقصود اور اس کی صبر آزما دسعتوں میں پھیلی ہوئی ایک ایک چیز کی حقیقت بھی ہم پر منکشف کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے عقل کو چراغ راہ سے تشبیہ دی ہے اور اس تشبیہ کی مدلل توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے؟ چراغ رہگزر ہے

یعنی عقل وہ نور ہے جو راستہ چلنے والے کی چشم بصیرت کو روشن کرتا ہے۔ اس سے راہ گیر کی نگاہوں میں علم و آگہی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے عقل رہگزر کا چراغ ہے جس کی روشنی میں وہ جادۂ منزل کے خطرات و مصائب کو دیکھتا اور انہیں مد نظر رکھ کر اپنا سفر کامیابی کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ انعام خداوندی کارفرما نہ ہو تو سالک راہ اپنے گردو پیش ایک ایسا تاریک ماحول پاتا ہے جس میں نہ وہ راستہ کو دیکھ سکتا ہے اور نہ منزل مقصود ہی پر پہنچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ لہذا قادر مطلق کی بے کراں بخششوں نے انسان کو عقل کی وہ دولت غیر مترقبہ عطا فرمائی ہے

سوا اُسے خلیفۃ الارض کے منصب جلیلہ پر فائز کرنے کا وسیلہ ہے اور جس سے وہ کائنات کی ہر چیز کے معارف و حقائق کو سمجھتا اور ان سے تقاضائے فطرت کے مطابق کام لیتا ہے۔ اگر یہ فوقیت اُسے حاصل نہ ہوتی تو انسان بھی دوسرے حیوانوں کی مانند جاہل مطلق کی حیثیت رکھتا اور اس صورت میں قدرت کاملہ کا وہ مقصد پورا نہ ہوتا جس کے لئے اس عالم ہزار شیوہ کی تخلیق ہوئی۔ یہ عقل ہی کا کرشمہ ہے کہ حضرت انسان مظاہر کمالات اور نوادر اختراعات سے اہل جہاں کو محو استعجاب بنا رہا ہے۔ اور یہی وہ قوت ہے جو علم و حکمت کے اسرار و غوامض ذہن انسانی پر واضح کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہے ؎

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

مجھ کو خرد نے حکیمانہ نظر عطا کی اور عشق نے رندی کا سلیقہ سکھایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ عقل، انسان کو علم و حکمت بخشنے والی چیز ہے۔ یہ جہل و ناوانی کا قلع قمع کر کے ذہن انسانی کو خبرد و دانش اور حکمت و تدبیر سے لبریز کر دیتی ہے۔ اس کا فرض ہی یہ ہے کہ حیوان نالق کے کندۂ ناتراش دماغ کو وحشت و بربریت کی جاہلانہ تاریکیوں سے پاک کر کے اسے ہوش و خرد کی روشنی سے منور کرے تاکہ انسان نظام عالم کو سمجھنے اور چلانے کے قابل بن سکے۔ اس شعر میں اقبالؒ نے نہایت فراخدلی سے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی حکیمانہ بلند نگاہی اور فلسفیانہ تدبر عقل و خرد ہی کا عطا کیا ہوا ہے ورنہ اس کے بغیر وہ زیور

دانش سے قطعاً محروم ہوتے اہل خرد کے کمالِ علم کا ثبوت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے؟
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے!

میں عقلمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے؟ میری ہستی کس مقام سے شروع ہوئی اور کن کن مراحل سے گذر کر کیا کیا منازل طے کر کے موجودہ حالت تک پہنچی اور پھر اس کی ابتدائی حقیقت کیا تھی؟ میں یہ باتیں کیا دریافت کروں؟ مجھے تو یہ فکر لاحق ہے میرا انجام کیا ہوگا؟ مجھے اپنے انجام کی فکر اور اپنی انتہا کا کھٹکا، ابتدا کا علم حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتا۔ میرا دل مستقبل کے تردد سے معمور ہے اس لئے اسے یہ فرصت ہی نہیں کہ ماضی کی واقفیت بہم پہنچانے کی طرف خیال کرے۔ عقل والے تو میری ابتدا کے متعلق تمام حالات جانتے اور بتا سکتے ہیں لیکن میں انجام کی فکرمندی اور انتہائی تشویش کے باعث یہ پوچھنا ہی نہیں چاہتا۔

اس شعر سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اہل خرد، انسان کے آغاز و ابتدا کے متعلق پورا علم رکھتے ہیں اور ماضی کے واقعات کو اپنے معلومات کی بنا پر اچھی طرح جانتے ہیں پس ثابت ہوا کہ یہ عقل و دانش ہی کا اعجاز ہے کہ انسان ہر قسم کے علوم و معارف سے حد کمال تک بہرہ یاب ہے۔

عشق

اس اظہار حقیقت کے بعد علامہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ عطیاتِ خداوندی میں سے عقل ہی وہ افضل و ارفع چیز ہے جو انسان کو علم اشیاء

اور امتیاز سود و زیاں کا دروازہ کھولتی ہے، یہی وہ قوت ہے جس کی مدد سے ہم دنیا و مافیہا کی تسخیر کرتے ہیں، اور اپنے ارد گرد کی تمام اشیاء کو دیکھتے، سمجھتے اور ان سے کام لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود چونکہ عقل محض چراغ راہ کا درجہ رکھتی ہے اس لئے اسے منزل آشنا نہیں کہا جا سکتا۔ چراغ راہ کا کام صرف یہ ہے کہ وہ راستہ میں پیش آنے والی چیزوں کو نمایاں کرتا ہے، بجائے خود منزل بن کر سامنے نہیں آ سکتا اور نہ منزل کے حالات سے کوئی واقفیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ؎

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا؟
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے؟

چراغ راہ کو اس کی کیا خبر ہے کہ گھر کے اندر کیا کیا واقعات پیش آ رہے ہیں۔ وہ تو یہ بتا سکتا ہے کہ یہ راستہ جس کے کنارے پر وہ چل رہا ہے، سیدھا گھر کے دروازے پر پہنچتا ہے اور اس راستہ میں فلاں مقام پر خطر ہے اور فلاں پر امن ہے مگر اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ گھر کے اندر کیا کچھ موجود ہے اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہ علم تو منزل ہی کو حاصل ہے۔ عقل اس سے عاجز ہے کہ درون خانہ وقوع پذیر ہونے والے ہنگاموں کے متعلق کچھ بتا سکے۔ وہ خود ایک ایسے مقام پر کھڑی ہے جو نہ حاضر ہے نہ غائب، نہ سامنے ہے نہ اوجھل چنانچہ:۔

تڑپ رہا ہے فلاطون میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

یعنی امام عقل حکیم افلاطون غیب و حضور کے درمیان تڑپ رہا ہے۔ اسے نہ حاضری نصیب ہے اور نہ غیر حاضری، ایک درمیانی کیفیت میں پڑا ہوا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عقل کا مقام شروع ہی سے اعراف مقدر ہے۔ اعراف ایک ایسی جگہ کا نام ہے جو نہ دوزخ ہے اور نہ بہشت، بلکہ دونوں کے درمیان کی ایک جگہ ہے۔ تو اعراف کی طرح اہل خرد کا مقام بھی ایک درمیانی جگہ ہے جسے نہ منزل میں داخل سمجھا جا سکتا ہے اور نہ منزل سے دور۔ اسی بنا پہ علامہ فرماتے ہیں:-

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اگرچہ عقل کا مقام بھی آستانِ مقصود سے قریب ہے مگر اس کی قسمت میں حاضری کا شرف نہیں اور نہ یہ جلوۂ بے نقاب سے آشنا ہو سکتی ہے۔ اس کی تقدیر کی محرومی اُسے قریب ہوتے ہوئے بھی حضوری کا فخر حاصل نہیں ہونے دیتی، اس لئے کسی ایسی چیز کی تلاش ضروری ہے جو منزل پہ پہنچا سکے۔ پھر وہ چیز کیا ہے؟

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!!

اگر تو حضوری کا خواہشمند ہے تو خدا سے دیکھنے والا دل مانگ تاکہ تو اپنی منزل مقصود کو اپنے روبرو دیکھ سکے۔ علم و حکمت سے جو نور تو نے اپنی آنکھوں میں پیدا کیا ہے، یہ منزل کو نہیں دیکھ سکتا۔ یہ تو فقط راستے کو دیکھ سکتا ہے منزل کو دیکھنے کے لئے دل کے نور

کی ضرورت ہے۔ نیز اسے حاصل کیا ہوا آنکھوں کا نور چونکہ منزل کو دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا اس لئے اُسے دل کے نور سے کوئی نسبت نہیں۔

اب جب کہ یہ امر پوری تحقیق کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ ؎

خِرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

کہ عقل منزلِ مقصود تک نہیں لے جا سکتی۔ وہ علم و خبر بہم پہنچانے کی طاقت رکھتی ہے اور علم و خبر انسان کی روحانی تشنگی بجھانے کے قابل نہیں وہ تو اسی صورت میں بجھ سکتی ہے جب کہ انسان اپنی آنکھوں سے منزل کو دیکھے۔ اس کے سوا اس کے بجھنے کی کوئی اور صورت نہیں ہو سکتا اور اسے انسانی کی تمام مشکلات کا علاج خود بخود سامنے آگیا ہے شاعر کو صاف صاف اعلان کرنا پڑا کہ ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل اور اس کی حدود سے آگے نکل جا تاکہ تو منزل کو پا سکے یعقل کو منزل مت خیال کر۔ یہ تو چراغِ راہ ہے جو تجھے منزل کی طرف جانے کا راستہ دکھا سکتا ہے۔ لیکن حیاتِ انسانی ایک ایسی چیز کی محتاج ہے جو نہ صرف منزل پر لے جائے بلکہ بجائے خود ایک منزل کی حیثیت رکھتی ہو جس کے حصول کے بعد کوئی مرحلہ طے کرنے والا باقی نہ رہے اور اگر ایک طرف وہ دل کا نور پیدا کرنے کا کامیاب ذریعہ ہو تو دوسری طرف انسان کی روحانی تشنگی کے بجھانے کا بھی غیر فانی وسیلہ بن جائے۔ علامہ مرحوم نے اپنے الہامات میں اس چیز کی حقیقت اور درجات و مراتب

کی نہایت شرح و بسط کے ساتھ وضاحت فرمائی ہے اور اپنی مخصوص فلسفیانہ موشگافیوں، عقلی و نقلی دلائل اور تاریخی و تمدنی براہین و تحویلات کے ناقابل انکار حقائق سے ثابت کیا ہے کہ وہ عشق ہی کی لطافت صادقہ ہے جو دین و دنیا، موت و حیات، جن و انس، فانی و غیر فانی عوالم کے تمام ارواح و اجسام غرضیکہ اس کارخانۂ قدرت کی ہر ظاہر و باطن چیز پر حاوی ہے، نظام عالم کا آغاز و انجام اسی کے وجود کا کرشمہ ہے اور یہی وہ نور ہے جو انسان کے دل میں منزل مقصود کو بے نقاب دیکھنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے اور جس سے اس کے سامنے عرفان حقیقت کے اسرار و رموز روشن ہوتے ہیں۔ جذبۂ عشق کی ان بے پناہ قدرتوں کو اثبات و دلائل کی روشنی میں لانے سے پیشتر مناسب ہے کہ اس کی تخلیق کے واقعہ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ ترجمان حقیقت نے اس کے متعلق اتنا بلند تخیل پیش کیا ہے جو ذہن انسانی کو متحیر کئے بغیر نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہو:-

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی !!
حرارت لی نفسہائے مسیح ابن مریم سے

خلاق عالم نے تخلیق عشق کے لئے ستارے سے چمک حاصل کی تاکہ اس جذبۂ لطیف کی سرمدا گیر روشنی چاروں طرف پھیل جائے اور چاند سے وہ داغ جو اس کے جگر میں ازل سے ابد کے لئے مقرر ہو چکا ہے، اس غرض سے مانگ لیا کہ لذت

کشتگان عشق کے سینے بھی بے تابیٔ ہجر اور ارمان وصال کے داغوں سے لبریز ہیں اور وہ اس کی روح افزا سوزش سے ہر وقت لطف اندوز ہوتے رہیں پھر رات کے پریشان بالوں یعنی تاریکی سے عشاق کو اُن کی تیرہ بختی کا رونا رلانے کے لئے تھوڑی سی سیاہی لی، دنیائے عشق میں بیقراری کی کیفیت پیدا کرنے کی خاطر بجلی سے تڑپ مانگی، جذبات عشق کو ادل سے آخر تک پاکیزہ و معصوم رکھنے کے خیال سے حور سے پاکیزگی حاصل کی اور مستی عشق کو زندگی بخشنے والی طاقت عطا کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانسوں کی حرارت لی تاکہ وہ ابن مریم کی طرح مردہ روحوں میں زندگی پیدا کر سکے۔

خدا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی

فلک سے عاجزی، افتادگی تقدیر شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمہ حیواں کے پانی میں

مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

ان چیزوں کو حاصل کر لینے کے بعد خدا تعالیٰ نے اپنی ربوبیت سے ذرا سی بے نیازی کی شان لی تاکہ عشق میں بھی بے نیازی کی شان ہمیشہ جلوہ گر رہے پھر اس بے نیازی کے ساتھ ہی خالق و مخلوق میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے عجز و نیاز کی کیفیت بھی ضروری تھی چنانچہ یہ چیز فرشتوں سے مہیا کی اور شبنم کی قسمت سے افتادگی یعنی گر پڑنے کا جوہر لیا تاکہ عشاق ہمیشہ اسی حالت سے دوچار رہیں اور ان کے دل میں کبر و غرور کا احساس کبھی پیدا نہ ہو۔

ان تمام اجزا کو جمع کر کے آب حیات میں گھولا گیا تاکہ جہاں عشق

کے پینے والے حیاتِ دوام کے حامل بن جائیں اور موت انھیں نیست ونابود کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بندۂ عشق بن کر انھیں ایک ایسی زندگی جاوید حاصل ہو جائے جس کا مٹ جانا حدودِ امکان سے باہر ہو اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں۔

جب یہ مرکب تیار ہو گیا تو عرشِ عظیم سے اس کا نام محبت قرار دے دیا گیا۔ یہ ہے تخلیقِ عشق کی سرگذشت۔ پھر اس کے بعد اس مرکب کو کہاں اور کس طرح استعمال کیا گیا اور پھر اس کے نتائج کیا مترتب ہو سکے؟ آئیے اس کا علم بھی اقبال کی زبانِ حقیقت بیان سے حاصل کریں:

مہوس نے یہ پانی ہستیِ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

اس کیمیاگر نے جو نسخۂ عشق کی ترکیب اور تیاری میں مصروف تھا، یہ پانی ہستی کے نوخیز یعنی نئے اٹھتے ہوئے چھوٹے سے وجود پر چھڑکا تو گویا اس نے اس نسخے جہان کے کاموں کی گرہ کھول دی۔ اس کا یہ عمل کارِ عالم کے لئے ایک افتتاح ثابت ہوا اور جہانِ ہستی میں جو ابھی تک اس حرکت کے نام تک سے بھی ناآشنا تھا، اس پانی کے چھڑکتے ہی ایک عالمگیر جنبش پیدا ہو گئی۔ چاروں طرف زندگی کی لہریں دوڑنے لگے

لگیں ، ذرے لطفِ خواب کو چھوڑ کر بیدار ہوئے اور اُٹھ اُٹھ کر اپنے اپنے ساتھیوں سے گلے ملنے لگے ، آفتاب اور ستارے خرام ناز میں محو ہوگئے غنچے چٹکنے لگے اور لالہ زاروں کے سینے داغوں سے لبریز ہوگئے۔ غرض ہستی کی ایک ایک چیز جوشِ عمل اور جذبۂ حرکت کے ولولوں سے لبریز ہو کر مصروفِ کار ہوگئی۔

اس تمام تاویل سے شاعر کا منشا یہ واضح کرنا ہے کہ عشق کے بغیر ہستی کا وجود ایک ساکت و صامت پتھر کی حیثیت رکھتا تھا ، نہ اس میں زندگی کی کوئی حرکت موجود تھی اور نہ عمل و احساس کی جنبش۔ لیکن جب عشق کی تخلیق ہوئی تو ذرے ذرے اور پتے پتے میں زندگی کے آثار پیدا ہوگئے اور ہر چیز اپنی موجودگی کا ثبوت دینے لگی۔ یعنی ساری کائنات عشق ہی کی محتاج و منتظر تھی اور عشق ہی عالم ہست کی اصل روح ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مخلوقات کی کوئی شے بھی دائرۂ امکان میں ظاہر نہ ہوتی + چنانچہ اس روشن حقیقت کو علامہؒ نے اپنے کلام میں جس بلند آہنگی سے پیش کیا ہے اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

سبحان اللہ ! شعر ہے کہ دو مصرعوں میں بند کیا ہوا بحر بیکراں ! حق یہ ہے کہ اس ایک شعر میں مقامِ عشق کی بلندی کا وہ منتہا بیان کر دیا گیا ہے جس کی ذخیرۂ الفاظ میں نظیر نہیں مل سکتی۔

دستِ قدرت نے موجوداتِ عالم کے جن لاثانی نقوش پر اپنے

تخلیقی اعجاز کا مظاہرہ کیا ہے، وہ حضرت جبرئیل علیہ السلام، فخر دو عالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور کلام الٰہی یعنی قرآن حکیم کی ذات مستجمع الصفات ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام کے مخصوص اعتقادی تصور ہی سے نہیں بلکہ تخلیق کائنات کے منشائے عمومی کی رو سے بھی صناع فطرت نے ان سے بڑھ کر کوئی چیز پیدا نہیں کی بلکہ ان کے برابر بھی کچھ معرض وجود میں نہیں آیا۔ یہ قدرت کے وہ عدیم المثال شاہکار ہیں جو اصلاحی و اخلاقی، مدنی، معاشی اور ظاہری و باطنی ہر نقطۂ نگاہ سے تمام مخلوقات پر بہ الامتیاز تفوق رکھتے ہیں اور پھر یہ تفوق ایک عام تصور کی بنا پر ہے، اگر اسلامی زاویۂ نظر سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ صرف سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰؐ کی ذات مقدس اتنی بلند اتنی ارفع و اعلیٰ ہے کہ خدا تعالیٰ خود بھی جا بجا تعریف کرتا ہے۔ بے شمار فرشتوں کو بھی مدح و ستائش پر مامور کیا ہوا ہے اور دنیائے جہاں کی ذی روح اور غیر ذی روح اشیاء کی زبان پہ بھی ہر وقت حضور ہی کی تسبیح جاری رکھتا ہے علامہ فرماتے ہیں کہ مخلوق خدا کی یہ مقدس ترین ہستیاں بھی عشق ہی کی بدولت منصۂ شہود پہ جلوہ فرما ہوئی ہیں ۔ یعنی پروردگار عالم نے اسی جذبۂ حقیقی سے سرشار ہو کر ان مقدسات سے خلعت وجود کو مزین کیا اور اس لحاظ سے نفس جبرئیلؑ اور دل مصطفیٰؐ عشق الٰہی کے مظاہر ہیں۔ شاعر نے اس صداقت کا نہایت شد و مد سے اعلان کیا ہے کہ جہاں فانی و غیر فانی کی ہر شے میں اول سے آخر تک عشق ہی کا افسوں کار فرما ہے۔ یہی نفس جبرئیلؑ کی شکل میں ظاہر ہوا ہے اور یہی پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا دل بن کر دنیا کے سامنے آیا ہے۔

خدا کا رسول بھی یہی ہے اور خدا کا کلام بھی یہی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر خداوند عالم کی ذات عشق و محبت کے جذبات سے متاثر نہ ہوتی تو نہ اُسے اپنا رسول بنانے کی کوئی ضرورت درپیش ہوتی اور نہ کسی سے باتیں کرنے کا اشتیاق پیدا ہوتا۔ مگر اس کے دل میں شرار عشق کی حرارت تھی، محبت کی آگ تھی جس کے اقتضا نے اسے اس امر پر مجبور کر دیا کہ اپنے ارمانوں کی تکمیل کے لئے محبوب بنائے اور اس سے باتیں کرے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اُسے تمام کائنات عالم وجود میں لانی پڑی۔ تو ثابت ہوا کہ اس کارگہ عالم کا سارا سلسلہ اور سارا انظام عشق ہی کی وجہ سے معرض ہست میں رونما ہوا ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں ؎

عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات
عشق ہے نور حیات، عشق ہے نار حیات

مضراب ایک چھوٹے سے آلے کا نام ہے جس سے ساز ستار سے نغمہ پیدا کرنے کے لئے اس کے تاروں کو جنبش دی جاتی ہے۔ جونہی اس آلے سے تاروں کو چھیڑا جاتا ہے، ان سے مختلف قسم کی آوازیں نکلتی ہیں اور وہ ایک دوسری سے مل کر نغمہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق وہ مضراب ہے جس سے زندگی کے تاروں میں نغمہ پیدا ہوتا ہے یعنی زندگی کا ساز اسی آلے سے بجتا ہے، اس کے بغیر اُس میں سے کوئی آواز پیدا نہیں کی جا سکتی۔ زندگی کا نور بھی عشق ہے اور زندگی کی حرارت بھی عشق ہے یعنی عشق ہی سے زندگی کی دنیا میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور

اسی سے زندگی کے وجود کو بقا کی حرارت ملتی ہے۔ پھر فرمایا ؎

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ نے آگ کے شعلوں میں کود کر جس عزم و استقلال جس صدق و تقویٰ کا مظاہرہ کیا، وہ بھی جذبۂ عشق ہی کا کرشمہ تھا۔ آپ چونکہ محبت الٰہی میں مخمور تھے اس لئے نہایت جواں مردی کے ساتھ موت کے آغوش میں جا پڑے اور پائے ثبات میں ایک ذرہ برابر جنبش نہ آنے دی تاکہ اس خوفناک امتحان سے گذر کر اپنے محبوب کا وصال حاصل کریں۔ پھر حضرت حسین علیہ السلام نے جس صبر و ضبط کے ساتھ خود بھی نہایت مظلومانہ حالت میں جام شہادت نوش فرمایا اور اپنے تمام کنبہ اور شیر خوار بچوں کو بھی راہ حق میں قربان کر دیا۔ کیا تاریخ عالم اس کی کوئی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ آپ چاہتے تو عرش و فرش کو زیر و زبر کر سکتے تھے مگر آپ نے عشق خداوندی میں سرشار ہو کر رضائے حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ چنانچہ حسین علیہ السلام کا صبر اور ابراہیم خلیل اللہؑ کا صدق۔ عشق ہی کے مناظر کی تصویریں ہیں اور حضور نبی کریمؐ کے ساتھ بدر اور حنین کے مقام پر جو معرکے ہوئے۔ وہ بھی اسی جذبہ کے طفیل پیش آئے۔ خدائے جل و علا کی محبت نے انہیں اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ توحید باری کا اعلان کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں اور اس سلسلہ میں جو تکلیف پیش آئیں، انہیں بڑی خوشی سے برداشت کریں۔ مخالفین سے جنگ و جدال کا اصل باعث بھی یہی تھا کہ آپؐ انہیں

اپنے محبوب کی اطاعت کی طرف بلاتے تھے اور اس کی واحدانیت پہ ایمان لانے کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ اس بنا پہ حضورؐ کی تمام معرکہ آرائیاں عشق ہی کی وجہ سے ظہور میں آئی ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے ذوق عشق کی طاقتوں کو ارض و سما پہ جاری و ساری پاتے ہوئے اُسے یوں مخاطب کیا ہے:۔

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

اے ذوق عشق! تو مظاہر عالم کا وہ معنیٰ ہے جو بڑی دیر سے ذہن انسانی پہ واضح ہوتا ہے، وہ مقصود جسے حاصل کرنے کے لئے بہت مدت درکار ہے اور دنیائے رنگ و بو کے قافلے تیری تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ کہ حسن و جمال اور خوبصورتی و رعنائی کی حین و دلکش تصویروں میں انسان محبت کی تلاش کرتا ہے۔ وہ بجائے خود تیری جستجو میں ہیں۔ زمانہ اُن کی تلاش کرتا ہے مگر وہ تیری تلاش میں پھر رہی ہیں۔ یعنی حسن اپنی جگہ پہ ذوق عشق کو ڈھونڈ رہا ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ کوئی قیمت نہیں رکھتا اور حسن و جمال کی دلکشی سے لطف اندوز ہونا مذاق عشق ہی پہ موقوف ہے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

لوح و قلم تیری ہی کسی صورت کا نام ہے کیونکہ وہ تیری خاطر بنائے گئے ہیں۔ اور تیرے ہی جلووں کی مختلف شکلیں لوح و قلم

بنا کر پیش کی گئی ہیں۔ تیری ذاتی وجود وہ صحیفۂ قدرت ہے جو مخلوقات عالم کی رہنمائی اور تکمیل مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے۔ تجھے دیکھ لینے سے وہ مدعا حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے کتاب کی ضرورت پیش آئی۔ تیری وسعتیں اس قدر بے حد و کراں ہیں کہ نیلگوں آسمان کا کہیں نہ ختم ہونے والا گنبد بھی ان میں ایک بلبلے کی حیثیت رکھتا ہے، تیرے محیط میں یہ ایک حباب کی طرح تیرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کتنی بلند حقیقت دو مصرعوں میں بیان کی گئی ہے؟

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب

پانی اور مٹی کے اس تمام عالم کو تیرے ظہور سے یہ بلندی حاصل ہوئی ورنہ ان چیزوں کی اپنی ذات میں کچھ حقیقت نہیں ہے۔ یہ تیرا ہی فیض ہے کہ انہیں اسقدر اونچا مقام نصیب ہوا۔ پانی اور مٹی کا یہ جہان حباب اپنے کارناموں سے عالم نور کو متحیر کر رہا ہے۔ یہ تیرے ہی قدم کی برکت سے اس مرتبہ کو پہنچا ہے۔ اور آفتاب جو اپنی نورانی روشنی سے زمین و آسمان کو منور کرتا ہے۔ ریت کا ایک ذرہ ہے۔ جو تیری ہی توجہ سے چشمۂ نور بن گیا۔ یہاں فلکیات کا یہ بڑا گہرا مسئلہ حل کر دیا گیا ہے کہ سورج، مادی ذرات کا ایک مجموعہ ہے۔

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

عشق کے جلال و جمال کے عارفانہ نکات اور ان کی شان و مرتبہ کو ذہن نشین کرنے کے لئے مختلف تاریخی مثالیں پیش کی گئی

ہیں۔ فرماتے ہیں، اے عشق سلیم و سنجر کی شوکت و عظمت، تیرے جلال کا ایک روشن ثبوت ہے۔ یعنی جہاں تو نے اپنے جلال کی قوت سے کام لیا، وہاں انسانوں کو سلیم و سنجر کے ایسے جاہ و منصب سے سرفراز کر دیا اور جہاں تیرے جمال نے اپنا نقاب اتار کر اہل جہاں پر نظر کی، وہاں جنید و بایزید رحمتہ اللہ علیہم کے فقر کا نمونہ پیش کر دیا۔ یعنی یہ تیرے جلال کا مظہر تھا جو سلیم و سنجر کی شان و شوکت کی صورت میں سامنے آیا اور وہ تیرے جمال کی شان تھی جس نے جنید و بایزید کو فقر کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ یہ دونوں صورتیں تیرے جلال و جمال کی آئینہ دار ہیں۔

شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام

میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

جب ہم نماز ادا کرتے ہیں تو اپنے رکوع و سجود اور دوسری تمام حرکات و سکنات کو امام کی ذمہ داری میں چھوڑ دیتے ہیں، امام صرف ہماری رہنمائی نہیں کرتا بلکہ ہماری نیت اور ارادہ کو اپنے بس میں لے لیتا ہے اور پھر اُسے قبولیت کی غرض سے خداوند ذوالجلال کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں، بالکل اسی طرح اگر نماز ادا کرتے وقت، انسان اپنے آپ کو ذوقِ عشق کی امامت پہ نہ چھوڑے، وہ اپنی نیت اور ارادہ کو شوقِ محبت کی ذمہ داری میں نہ دیدے تو اس کا قیام بھی ایک پردہ کی مانند ہوتا ہے۔ اور سجود بھی۔ یعنی اگر ہم جذبۂ عشق کی رہنمائی میں نماز ادا نہ کریں۔ اگر ہماری بندگی میں محبت کا شوق ہماری امامت نہ کرے تو ہماری یہ

نماز جسے ہم حقیقت کے چہرہ سے پردہ اُٹھانے کے لئے ادا کرتے ہیں، بجائے خود ایک پردہ بن کر ہمارے اور حقیقت کے درمیان پھیل جاتی ہے۔ نماز کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ خدا اور بندہ کے درمیان حائل ہونے والی چیزوں کو نیست و نابود کرے اور ان حجابات کو درمیان سے اٹھاوے جو سالک اور منزل کے درمیان پڑے ہوئے ہوں تاکہ قرب الٰہی کے حصول کے لئے راستہ صاف ہو جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ نماز میں ذوق عشق ہماری رہنمائی کرے اور ہماری نماز جذبۂ عشق سے معمور ہو۔ اور اگر یہ نہ ہو تو یہی سجدے اور یہی قیام ہمارے اور معرفت الٰہی کے مابین حجاب بن کر حائل ہو جائیں گے۔ گویا نماز ہی جو ہمارے لئے حصول مقصد کا ذریعہ ہے، ہمیں راستہ سے ہٹا دے گی اور مقصد سے دور لے جائے گی۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دین تبکدۂ تصورات

اس شعر میں یہ ثابت کیا ہے کہ قوائے انسانی عشق ہی کی رہنمائی کی محتاج ہیں اور وہ اسی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتی ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی قوتیں تین ہیں جن پر اُس کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ عقل، دل اور نگاہ۔ انہی طاقتوں کے بھروسے پر وہ دنیا بھر کے کام انجام دیتا ہے اور انہی کی مدد سے عروج و ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ ان تینوں طاقتوں کا اولیں رہنما بھی عشق ہے، وہی ان کو ترقی اور کامیابی کا راستہ

دکھاتا ہے اور اسی کی ہدایات اُن کی ہر کام میں معاونت کرتی ہیں۔
اگر عشق ان کی رہبری نہ کرے، انہیں حصول مقصد کے طریقے نہ
سکھائے تو انسان کسی مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ دوسرے
مصرعہ میں ایک بہت ہی بلند نکتہ بیان ہوا ہے اور وہ یہ کہ اگر عشق
نہ ہو تو دین اور اس کا پروگرام (شریعت) تصورات کے ایک بتخانہ
کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی عشق کے بغیر دین ایک ایسا تبکدہ ہے
جس میں خیالی تصویریں بھری پڑی ہیں، اور اس کا ضابطۂ نظام بھی
چند خیالات کے مجموعہ سے زیادہ نہیں۔ مطلب یہ کہ اگر عشق
کی قوت کارفرما ہو تو دین و شریعت کچھ حقیقت نہیں رکھتے اور
بیکار محض ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک
جگہ لکھتے ہیں:۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق

اگر انسان کی عملی کوتاہیاں اُسے حدِ کفر تک پہنچا چکی ہیں یا وہ
گمراہی کے تاریک غاروں میں گر ڈوب کر دین و ایمان سے بے بہرہ
ہو چکا ہے مگر اس کے دل میں جذبہ عشق کی چنگاری موجود ہے
تو وہ درحقیقت مسلمان ہے اور اس ایمان والے اور صاحب
عمل مسلمان سے اپنے کفر کے باوجود اچھا ہے کیونکہ وہ اس حقیقی
نشہ سے سرشار ہے جو تخلیقِ کائنات کا اصل باعث ہے۔ لیکن
اگر ایک مسلمان انسان، ایمان و عمل کی دولت سے مالا مال ہے
اور اسلام کے بتائے ہوئے راستہ پر نہایت حزم و احتیاط کے

ساتھ چلتا ہے مگر اس کا دل عشق کی نعمت سے خالی ہے تو وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہوئے بھی کافر و زندیق ہے کیونکہ اس نے اسلام کی اصل علم کو نہیں سمجھا اور ایک اندھے انسان کی طرح ایسے راستے پہ چلنا شروع کر دیا ہے جو کسی منزل پر نہیں پہنچتا۔ اس کے دل میں وہ جذبہ تو موجود ہی نہیں جو شعائر اسلام کی پابندی اور ذکر و فکر کا اصل مقصود ہے اور جس سے اس کے زہد و اتقا میں برکت اور عمل میں قبولیت کا جوہر پیدا ہوتا ہے۔ اسی بنا پہ شاعر کہتا ہے۔ کہ اگر دل میں عشق کی حرارت موجود ہے تو عمل و اعتقاد کا کفر بھی مسلمانی کا درجہ رکھتا ہے اور اگر عشق ہی کا جذبہ دل میں موجود نہیں تو ایک مسلمان بھی کافر ہے اور اس کے لئے دین اور شریعت تصویروں کے ایک بُت خانہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس پر از حقائق استدلال سے یہ امر پورے طور پر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا کہ عالم ہستی کی ہر شے اپنے وجود، زندگی اور عمل و حرکت کے لئے عشق ہی کی مرہونِ منت ہے اور یہی وہ طاقت ہے جو کون و مکان کی تخلیق کا باعث ہوئی بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر علامہ اقبالؒ اپنے اس بنیادی تخیل کو بھی صاف لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ عشق، کائنات کو عالم وجود ہی میں لانے کا سبب نہیں بلکہ یہ خود ہی مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اشعار قابلِ غور ہیں:۔

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق

عشق کہیں آوارہ و بے خانماں پھرتا ہوا نظر آتا ہے اور کہیں شاہوں کا شاہ بن کر نوشیرواں کی صورت میں جلوہ گر ہے یعنی اگر ایک طرف آوارگی و خانہ بربادی کی حالت میں پھرتا ہے تو دوسری طرف نوشیرواں عادل جیسا عظیم الشان شہنشاہ بنا ہوا ہے۔ آوارہ لوگوں میں بھی اسی کا جلوہ ہے اور شہنشاہوں میں بھی اسی کی نمود ہے۔

کبھی میدان میں آتا ہے زرہ پوش
کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

کبھی ہتھیار پہن کر میدان میں جنگ کرنے کے لئے آتا ہے تو کبھی بغیر تیر و تلوار کے ننگے بدن دکھائی دیتا ہے۔

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرور انجمن عشق

کہیں عشق کوہ و میدان کی تنہائی بنا ہوا ہے اور کہیں محفل کی رونق اور سوز و سرور کی شکل میں نمایاں ہے یعنی یہ تمام حالتیں عشق ہی کے مختلف مناظر کی ہیں اور اسی کے یہ سب روپ ہیں۔

کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق

کبھی عشق محراب و منبر کی زینت بن کر خطیب کے فرائض سرانجام دینے میں مصروف ہے اور کبھی قلعۂ خیبر کو فتح کرنے والی جلیل القدر انسانیت یعنی حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ کی شکل میں جلوہ افروز ہے۔

پھر ارشاد ہے:۔

شیشۂ دہر میں مانندِ مے ناب ہے عشق
روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشق

جس طرح صراحی میں انگور کی شراب بھری ہوئی ہوتی ہے، اسی طرح عشق زمانے کی صراحی میں بھرا ہوا ہے۔ یہاں زمانے کو صراحی یا بوتل سے اور عشق کو شراب انگور سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح شراب انگور کے بغیر صراحی بالکل بے حقیقت چیز ہے، اسی طرح عشق کے بغیر زمانہ کوئی معنی نہیں رکھتا، وہ ایک خالی بوتل کی طرح ہے۔ عشق سورج کی روح اور چاند کی رگوں کا خون ہے۔ نہ سورج اس روح کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے اور نہ چاند اپنی رگوں کے خون کے بغیر جی سکتا ہے تو گویا سورج اور چاند کو عشق ہی سے زندگی حاصل ہے۔

ہر دلِ ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

ہر ذرہ کے دل میں اس کی کسک پوشیدہ ہے اور یہ وہ نور ہے جس کی ہر شے میں جھلک ہے۔ کوئی چیز اس کے ظہور سے خالی نہیں۔

کہیں سامانِ مسرت کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

کہیں خوشی اور عیش کا سامان بنا ہوا ہے اور کہیں غم کا ساز ہے، کہیں موتی بن کر صدف کے آغوش میں روپوش ہے، کہیں آنسو کا وجود اختیار کر کے آنکھوں میں مچل رہا ہے اور کہیں شبنم کے قطرات

بن کر برگ گل کے رخساروں سے لپٹا ہوا ہے۔ غرضیکہ عشق ہی وہ زندۂ جاوید حقیقت ہے جو تخلیقات قدرت کی بے شمار شکلیں اختیار کر کے ہمارے سامنے آتا ہے، یہی حیات عالم کی اصل روح ہے اور اسی کی بدولت یہ اشرف المخلوقات عروج و ارتقا کے اُن منازل تک پہنچتا ہے جن کا وہ خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا۔ ایک مرد خدا کے لئے عشق ہی وہ زینہ ہے جو اُسے سربلندی و سرفرازی کے آسمان تک پہنچا سکتا ہے اور جس سے وہ حیات دوام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے وہ حیات ابدی جو موت کی دسترس سے باہر ہے ؎

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

موازنۂ عقل و عشق

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تیری
میرے درویش! خلافت ہے، جہانگیر تیری

مراتب عقل و عشق کے فلسفہ پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کلام میں بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اور دونوں کے تدریجی حدود کا ایسا حیرت انگیز تعین کیا ہے کہ اگر اُسے مافوق الادراک معجزہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ پروردگار عالم نے اپنا حق نیابت بخشنے اور خلافت ارضی عطا کرنے کی غرض سے جب حضرت انسان کو منتخب فرمایا تو اُسے دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز کرنے کے لئے عقل اور عشق کی دو قوتوں سے مشرف کیا کیونکہ یہی وہ چیزیں تھیں جو امانت خداوندی کا بار اُٹھانے اور اُسے منزل مقصود تک پہنچانے کا جوہر رکھتی تھیں اور جو خالق ارض و سما کے منشائے حقیقی کو سمجھنے اور مخلوق کے فرائض کو جاننے کے بعد نظام کائنات کے مقصد کو پایۂ کمال تک پہنچانے کی اہلیت رکھتی تھیں۔ لہٰذا انسان کو ان دونوں خصائص سے متصف کر کے یہ بتا دیا گیا کہ خدا تعالیٰ نے اُسے اپنا خلیفہ اور نائب مقرر کیا ہے اور چونکہ یہ ذمہ داری بہت ہی وزنی اور اہم تھی، اس لئے اُس کو عقل اور عشق کی دو ایسی قوتیں عطا کر دی گئی ہیں جن سے وہ اس ذمہ داری کے بوجھ کو بآسانی اٹھا سکے۔ اگر وہ ان دونوں طاقتوں سے تقاضائے فطرت

کے مطابق کام سے تو اپنا حق نیابت پوری کامیابی کے ساتھ حاصل کر سکتا ہے اور دوسری کسی چیز کو اس کے راستہ میں حائل ہونے کی جرأت نہ ہوگی۔

حضرت اقبالؒ نے اوپر کے شعر میں اسی نکتہ کی تشریح کی ہے۔ آپ انسان کو مخاطب کر کے عقل و عشق کی قوتوں سے کام لینے کا وہ اقتضا بیان فرماتے ہیں جو قدرت نے ازل سے معین کیا ہے اور جس کا حصول خلافت کے مقصد تک پہنچنا گزیر ہے۔ کہتے ہیں:۔

اے انسان، اے سالک راہ! عقل اور عشق تجھے اس غرض سے عطا ہوئے ہیں کہ تو ان سے صحیح طریقہ پہ کام لے کر منصب خلافت حاصل کرے اور وہ صحیح طریقہ جس کا انتخاب قدرت کی طرف سے عمل میں آچکا ہے، یہ ہے کہ عقل کو تو سپر کے طور پر استعمال کرے کیونکہ یہ تیری ڈھال ہے جو جادۂ منزل میں ہر مخالف قوت اور نقصان پہنچانے والی چیز سے تیری حفاظت کرے گی۔ تجھ پہ حملہ آور ہونے والی ہر ایک طاقت کا مقابلہ کرنا اس کا فرض ہوگا۔ پھر یہی نہیں کہ وہ صرف تیرے دشمنوں کے وار روکے گی بلکہ تجھے غلط راستہ پہ جانے سے بھی بچائے گی اور صحیح راہ پہ چلنے میں خضر راہ ثابت ہوگی۔ اور دوسری قوت یعنی عشق، یہ تیری تلوار ہے۔ اس سے تلوار کا کام لے اور حصول مقصد کی راہ میں جو خطرات و مصائب تجھے پیش آئیں، اس شمشیر کے جوہر آبدار سے اُن سب کا قلع قمع کر۔ یہ تجھے اس لئے بخشی گئی ہے کہ سدِ راہ ہونے والی طاقتوں کو کاٹتا ہوا بے خوف و خطر بڑھتا جا۔ اس کی موجودگی میں تجھے کسی چیز سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا قبضہ

تیرے لئے نصرت و اقبالمندی کا قبضہ ہے، جب تک تو اسے اپنے ہاتھ میں رکھیگا، دونوں جہاں کی فتح و کامرانی تیرے قدم چومتی رہیگی۔

میرے درویش! اگر تو نے عقل اور عشق کی طاقتوں سے فطرت کے مجوزہ طریقہ پر کام لیا تو نہ صرف تجھے منصب خلافت اور حق نیابت مل جائے گا بلکہ قرب الٰہی کی نعمت سے بھی تو مالامال ہو جائے گا لیکن اگر تو نے اس طریقہ پر ان قوتوں کو استعمال نہ کیا تو تیری تمام محنت فضول اور رائگاں ہوگی، جو کوئی کامیاب نتیجہ اور مفید ثمر پیدا نہیں کر سکے گی۔

پھر اسی کے ساتھ آگے چل کر اس حقیقت کو بھی صاف طور سے بے نقاب کر دیا ہے کہ عقل اور عشق کے اُس تحدید و توازن کو بھی کسی حالت میں فراموش نہیں کرنا چاہئے جو ان دونوں کے درمیان ابتدا ہی سے موجود ہے۔ عشق کا مقام عقل کے مقام سے بہت بالاتر ہے کیونکہ زندۂ جاوید حقیقت رکھنے والا ایک جوہر ہے اور یہ فنا کی نیند سونے والی ایک روشنی۔ چنانچہ فرمایا:۔

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق

یعنی عشق، موجودات عالم کو صحیح حالت میں منتقل کرنے والے اس پرانے نسخہ کی تمہید ہے جسے ابد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ نسخہ عشق ہی کے آغوش میں بنتا ہے عقل کا وجود تو صرف انسانی دماغ تک محدود ہے اور انسان کے فنا ہونے پر اس کے وجود کا فنا ہو جانا بھی ناگزیر ہے لیکن عشق کی روح اُن چیزوں میں بھی موجود ہے جو فنا کی لذت سے کبھی آشنا نہیں ہوں گی۔ اس لحاظ سے عقل اور عشق کے مراتب

میں بڑا بھاری فرق ہے ۔

عشق اپنے ماننے والوں کو ہر مقصد اور ہر کامیابی سے ہمکنار کر دیتا ہے ۔ کوئی ایسی چیز نہیں جسے اس کی کشش اپنے قریب نہ کھینچ لائے اس لئے ہر منزل تک پہنچنے اور ہر مقصود کو حاصل کرنے کے لئے عشق ہی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے ۔ عقل پر نہیں کیونکہ وہ منزل کے راستہ کو تو روشن کر سکتی ہے مگر منزل پر پہنچانا اس کے اختیار سے خارج ہے عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ہر قدم پر علم و خبر کے تمام گوشے نمایاں کر دیتی ہے مگر تکمیل مقصد کی قوت سے عاری ہے ۔ اس لئے عقل کی گوناگوں صناعیوں اور بوقلموں جدت طرازیوں سے مسحور ہو کر اُسے منزل مقصود تک لے جانے کا وسیلہ تصور کر لینا ، بہت بڑی غلط فہمی ہے ۔ یہ اقدام منزل کو قریب لانے کی بجائے دور سے بھی دور تر لے جاتا ہے ۔ یہی باعث ہے کہ ہمارا شاعر عقل سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوا عشق کی آرزو کرتا ہے ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں

میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

میں عقل و خرد کے تمام عقدے حل کر چکا ہوں اور اس کے بعد بھی کچھ حاصل نہیں ہوا ، اس لئے اے میرے مولا ! مجھے جو عشق کی دولت عطا کر تا کہ میں اپنے مقصود کو حاصل کر سکوں ۔ ثابت ہوا کہ عقل انسان کو منزل تک نہیں پہنچاتی اور نہ اُس سے وہ مقصود دستیاب ہوتا ہے ۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے ؎

عطار ہو ، رومی ہو ، رازی ہو ، غزالی ہو " کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

عقل و خرد اور علم و حکمت سے خواہ انسان کسی بھی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے شیخ عطار کا درجہ کو حاصل کرے یا مولانا روم کا، رازی کے برابر ہو جائے یا غزالی کے، اُسے کچھ بھی میسر نہیں ہو سکتا جب تک کہ عشق و محبت کا جذبہ کار فرما نہ ہو یعنی انسانیت اور اس کے علم و حکمت کا مرتبہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور نہ وہ معرفت الٰہی کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے جب تک کہ وہ سمندر عشق کی بیکرانیوں میں ڈوب کر شب بھر آہ و بکا میں مصروف نہ رہے یہ عشق ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ عرفان خداوندی کے ممتاز ترین درجوں پر پہنچ گئے اور انہیں یہ قرب اسی وجہ سے حاصل ہوا کہ ان کا علم، ان کی عبادت، ان کا ذکر و فکر سب عشق کی رہنمائی میں انجام پاتے تھے۔ وہ جو کچھ کرتے تھے خوب عقیدت ڈوب کر کرتے تھے چنانچہ انہیں وہ رفیع الشان مراتب نصیب ہوئے جو ابد تک کے لئے روشنی کا مینار بنے رہیں گے۔

اقبال نے عقل کی اس کوتاہی پر کس فلسفیانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے ؎

ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

ہمارا نرم رفتار قاصد، آہستہ خرام نامہ بر زندگی کا پیغام لایا۔ سو کائنات کے لئے زندگی کا پیغام عشق ہی پر موقوف تھا، دوسری کوئی طاقت اس کام کو سرانجام نہ دے سکی حتیٰ کہ جن کو بجلیاں مشرق و مغرب کی خبریں بہم پہنچاتی تھیں، وہ بھی اس پیغام سے بے خبر ثابت ہوئے۔ یعنی حکمت و دانش کے ذریعہ سے جو لوگ بجلی سے معلومات حاصل کرنے کا کام لیتے تھے، زندگی کے پیغام کا علم انہیں بھی حاصل نہ ہو سکا، وہ صرف اس کائنات کی خبر دے سکے جس کے ہر طرف موت کی حکومت ہے مگر اس عالم کی نسبت

ان کا علم ایک حرف تک بھی معلوم نہ کر سکا جہاں حیات جاودانی کا ظہور ہے
اسی نکتہ کو ان معنوں میں بھی واضح کیا گیا ہے کہ ؎

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا؛
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں!

علامہ مغفورؒ نے اس شعر میں فلکیات کے ایک نہایت دقیق مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ علمائے نجوم اور فضلائے علم الافلاک کے تقریباً تمام گروہ اس خیال پر متفق ہیں کہ تقدیر انسانی کا سعد و نحس اجرام سماوی سے تعلق رکھتا ہے اور ہر ایک شخص کی قسمت کسی نہ کسی سیارے کی رفتار و گردش سے وابستہ ہے۔ جب کسی انسان پر زوال و بدبختی کا دور نازل ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کی قسمت سے متعلقہ ستارہ گردش کرتا ہوا کسی ایسے برج میں پہنچ جاتا ہے جو اس کے لئے ناموافق اور نحوست کا باعث ہوتا ہے۔ اور جب اسی شخص پر خوش بختی کا زمانہ آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی قسمت کا ستارہ اس برج میں چلا جاتا ہے جو اس کے لئے موافق اور موجب سعادت ہوتا ہے۔ غرضیکہ ستاروں کی گردش ہی بنی نوع انسان پر اچھے یا برے دن لانے کی ذمہ دار ہے اور چونکہ انہی ستاروں سے انسانوں کے سعد و نحس کا تعلق ہے اس لئے انہی کی گردش کے حساب سے ان کے ماضی، حال اور مستقبل کے حالات معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن فیلسوف اعظم علامہ اقبالؒ علمائے نجوم کے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غریب ستارہ میری تقدیر کے متعلق کیا خبر دے سکتا ہے؛ وہ تو خود ہی آسمانوں کی وسعت میں ذلت و خواری

کے ساتھ بھٹکتا پھرتا ہے۔ افلاک کی وسعت اور فراخی اتنی بے حد و بے کراں ہے کہ ستارے اس کے مقابلے میں اپنی چھوٹی سی ہستی اور ننھا سا وجود رکھنے کے باعث بالکل آوارہ و بے مقام چاروں طرف گھومتے پھرتے ہیں اور اپنے لئے بھی کوئی جگہ حاصل کرنے سے عاجز ہیں کیونکہ افلاک کی وسعتوں کے سامنے ان کی کیا حقیقت ہے؟ توجس چیز کو خود اپنے مقام کا بھی علم نہیں اور وہ آسمان کی ناقابل فہم و تصور فراخیوں میں ذلیل و خوار بھٹک رہی ہے اُسے انسان کی قسمت کا علم کیا ہوگا اور وہ اس کے متعلق کچھ بتا کیا سکیگا؟

معلوم نہیں اقبالؒ عقیدۃً اس مسئلہ کے قائل تھے یا نہیں بہر حال یہ ظاہر ہے کہ اس طریق استدلال سے ان کا منشار مضمون کی بلندی کے علاوہ یہ واضح کرنا بھی ہے کہ عقل و خرد اور علم و دانش کی کوئی طاقت ذہن انسانی پر انسان کی تقدیر اور حقیقی منزل مقصود روشن نہیں کر سکتی، زمین تو زمین خود آسمانوں کے ستارے اور ان کا علم رکھنے والے بھی کچھ نہیں بتا سکتے۔ چنانچہ اس کی دلیل کے طور پر ارشاد ہے ؎

محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

بینائے کواکب (ستاروں کو دیکھنے والا) علم نجوم کا فاضل، دانائے نباتات (نباتات کا جاننے والا) علم نباتات کا عالم۔ ستارے آسمان کی مخلوق ہیں اور نباتات زمین کی پیداوار۔ تو مطلب یہ ہوا کہ کوئی شخص علم الافلاک کا ماہر یا علم الارض کا فاضل، اس امر کے متعلق کچھ واقفیت نہیں رکھتا کہ فطرت کا وہ نغمہ کیا ہے جو ازل سے الاپا گیا ہے؛ یعنی وہ سازِ فطرت

کے ازلی سرود کو جانتا ہی نہیں۔ یہ توفیق صرف **عشق** ہی کو ارزانی ہوئی ہے کہ نغمۂ فطرت کے لطف و سرور کی حقیقت سے انسان کو آگاہ کرے۔ عقل تو ابھی تک خدا کی ہستی کے متعلق بھی انسان کو کسی فیصلہ پر نہیں پہنچا سکی۔ یہی وجہ ہے کہ ؎

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات!

اگر میں صرف عقل کے فیصلوں پر یقین کئے رہتا تو خدا کے ہونے اور نہ ہونے کے متعلق مجھے کوئی علم بھی حاصل نہ ہوتا۔ نہ میں یہ سمجھ سکتا کہ خدا موجود ہے اور نہ یہ کہ خدا موجود نہیں ہے کیونکہ عقل کے نظریئے ہر وقت تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ وہ اپنی واقفیت کی بنا پر کبھی خدا کی ہستی کا ثبوت پیش کر دیتی اور کبھی اس سے انکار کر دیتی۔ اس کی فکر کسی صحیح اور اٹل فیصلہ پر پہنچنے اور قائم رہنے سے عاجز تھی۔ اس لئے میں نے عقل و خرد کے ہر لحظہ تغیر پذیر ہونے والے نظریات کو باطل خیال کیا اور اہل خرد سے الگ ہو کر دامن **عشق** میں پناہ لی۔ اس دنیا کے ایک ہی شخص نے مجھ پر حقیقت حال منکشف کر دی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ عقل والوں کا پورا گروہ ایک **عشق** کے برابر بھی واقفیت نہیں رکھتا۔

صحبت پیر رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

حضرت مولٰنا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے مجھ پر یہ راز ظاہر ہوا کہ ایک سر فروش **عشق**، اُن ایک لاکھ خردمندوں سے اچھا ہے جو سروں کو جھکائے غور و فکر میں محو ہوں۔ یعنی مولانائے رومؒ کے

فیضِ صحبت سے مجھے پتہ لگا کہ گریبانِ عقل میں سر ڈالے ہوئے لاکھ حکیم بھی وہ حقیقت بیان نہیں کر سکتے جو ہتھیلی پر سر رکھنے والا ایک عشق پسند بتا سکتا ہے۔

ثابت ہوا کہ عشق کے بغیر حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچنا اور بارگاہ خداوندی کی حضوری حاصل کرنا قطعی طور پہ دائرہ امکان سے خارج ہے کیونکہ عقیدت ہی وہ قوت ہے جو انسان کو تقرب الٰہی کے فخر سے سرفراز کر سکتی ہے عقل میں یہ جوہر موجود نہیں ہے

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

اُسی مٹی کو (مٹی سے یہاں انسان مراد ہے) جو حکمت کے بیابانوں میں مدتوں تک آوارہ پھرتی رہی، آخر کار محبت کی گلی میں آسودگی نصیب ہوئی۔ حکمت کے وسیع صحراؤں میں اُسے سکونِ قلب کی کوئی کیفیت حاصل نہ ہو سکی کیونکہ اس کے دل کو اطمینان بخشنے والی کوئی چیز وہاں موجود ہی نہ تھی، وہ مٹی کئی مدت تک ادھر اُدھر بھٹکتی پھرتی رہی مگر اس کی یہ تمام کوشش بے سود ثابت ہوئی کیونکہ اُسے کسی نتیجہ پر نہ پہنچا سکی اور بالآخر اُسے محبت ہی کے کوچہ میں اپنا مقصود ملا جس سے اُس کے دل کو آسودگی و تسلی میسر ہوئی۔ پھر قوتِ عشق کی گہرائیوں کا ثبوت کس خوش اسلوبی سے دیا گیا ہے؟

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

عقل کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات نے مجھے سمجھایا تھا کہ یہ زمین اور آسمان اپنی وسعت کے اعتبار سے بے حد و حساب ہیں اور ان کو عبور کرنا دائرہ امکان سے باہر ہے۔ ان کی کوئی انتہا نہیں اور

نہ کوئی کنارا ہے۔ لیکن عشق کی ایک ہی جست (چھلانگ) نے اس لاانتہا فاصلہ کو طے کر کے ایک آن میں قصہ ختم کر دیا۔ گویا ارض و سما کی بیکراں وسعت جو عقل کے فہم و ادراک سے بھی بالاتر تھی اور جسے عبور کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی عشق کی ایک جست کے فاصلہ کے برابر نکلی۔ سرکار دو عالم سرور کونین حضرت محمد مصطفٰے ایک لمحہ میں عرش بریں پر پہنچ گئے اور اس قدر بلندی تک پہنچنے میں قوت عشق ہی نے رہبری کی۔ بظاہر عرش پر جانا ایک انسان کی بساط سے باہر ہے لیکن کمال عشق نے اس ناممکن بات کو بھی ممکن بنا کے دکھایا۔ مقام عشق کی کتنی مبسوط تشریح ہے اور مدارج عقل و عشق کا کیسا حقیقت افروز خاکہ؟

پھر شاعر کے قلم اعجاز رقم کی حقیقت نگاری اسی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ درجات عقل اور عشق کے امتیاز کو اور بھی روشنی میں لاتی ہے تاکہ سامع کے دل و دماغ میں الجھن کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی!

عشق، بلا خوف و خطر آتش نمرود میں کود پڑا اور عقل ابھی تک لب بام تماشا دیکھنے میں محو ہے۔ شاعر نے اپنے نظریہ کی صداقت میں ایک ناقابل انکار تاریخی برہان پیش کی ہے اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ملحد اعظم نمرود نے بتوں کو توڑنے کی اہانت کا بدلہ لے کر انہیں خوش کرنے اور اپنے ادعائے باطلہ کو (معاذ اللہ) صداقت ایزدی پر فائق ثابت کرنے کے وہم میں لکڑیوں کے ایک بہت بڑے انبار میں آگ

گوائی اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو نذر آتش کرنے کے لئے اس
آتشین کے قریب لایا گیا تاکہ توحید باری کی یہ زندہ روشنی خاک سیاہ
کے ڈھیر میں روپوش کر دی جائے اور نمرود کے دجل و الحاد کو کاذب
یا باطل ٹھہرانے والی کوئی دلیل باقی نہ رہے تو یہ حق و باطل کا ایک بہت
بڑا امتحان تھا اور عقل و عشق کا ایک عظیم الشان معرکہ۔ آسمان سے
باتیں کرتے ہوئے ہولناک شعلے ایک طالب حق کا ایمان و استقامت
دیکھنے کے لیے ایک عشق کی زندگی اور موت کا سوال بن کر چاروں
طرف لپک رہے تھے اور اس جستجو میں تھے کہ کوئی مرد خدا ان کے آغوش
میں کھڑا ہو کر [illegible]ی کی سچائیوں کا اعلان کرے اور یہ ثابت کر
دے کہ قادر مطلق کی نشانیوں کو کوئی طاقت نیست و نابود نہیں کر سکتی
بلکہ قدرت اپنی صداقتوں کی خود حفاظت کرتی ہے اور اہل دنیا کا کوئی امتحان،
کوئی ابتلا انہیں مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ عقل نے عقیدت کو آزمائش
میں ڈالنے کے لئے یہ اذیت آفریں طریقہ تو تجویز کر لیا کہ اُسے جلتی ہوئی
آگ میں پھینک کر فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے مگر اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا
اگرچہ عشق ایک زندۂ جاوید حقیقت کا نام ہے اور عقل خود فانی ہے۔

جب یہ آگ حرارت کے آخری درجہ تک پہنچی تو کفار و مشرکین
کی اس وسیع دنیا میں سے جو اس ڈرامہ کو دیکھنے کے لئے اردگرد کے
تمام ماحول میں پھیلی ہوئی تھی، اہل نمرود اس فکر میں محو ہو گئے کہ اس خوفناک
آگ میں جس کی حرارت ایک طرف میلوں تک ہے اور دوسری طرف آسمان
تک پہنچ گئی ہے، ابراہیمؑ کو کس طرح پھینکا جائے، کون لوگ یہ کام کریں
اور کیا ترکیب استعمال کی جائے؟ ابھی عقل کے بندے اتنی غور آرائیوں

میں مصروف تھے اور کس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے تھے کہ عقیدت جانباز حضرت ابراہیم علیہ السلام، بلا خوف و خطر، بلا غور و فکر اس جہاں سوز آگ میں کود پڑے ؏

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

اور لب بام پر بیٹھ کر تماشا دیکھنے والے عقلمندوں نے دیکھ لیا کہ ... نے اپنی صداقت کا امتحان دینے کے لئے ایسی بے تابی کا اظہار کیا کہ آگ کے اس حیرت انگیز انبار کی بھی پرواہ نہ کی جس کی دہشت سے گرد و نواح کی فضائیں کانپ رہی تھیں۔

جونہی ابراہیم علیہ السلام کا قدم اس آگ پر پڑا، خداوند عالم نے اسی وقت آگ کو حکم دیا:۔

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ○ (الانبیاء)

کہ اے آگ، میرے چاہنے والے، میری خدائیت کا پیغام اہل زمین کو سنانے والے ابراہیم کی حفاظت کے لئے ٹھنڈی ہو جا، اتنی سرد جو زندگی اور سلامتی دینے کی حدود سے آگے نہ جا سکے تاکہ اُسے سردی کی شدت سے بھی کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا احتمال نہ رہے۔ اس حکم کے ملتے ہی آگ ٹھنڈی ہو گئی اور حضرت ابراہیمؑ کا بال تک بیکار نہ ہو سکا۔ اس واقعہ سے حق کو وہ عظیم الشان فتح اور باطل کو وہ شکست فاش حاصل ہوئی جو تاریخ عالم کے اوراق میں ابدالآباد تک کے لئے سنہری حروف میں جلوہ گر رہے گی۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ یہ عقیدت ہی کا کام تھا کہ وہ نمرود کی آگ میں بے خطر کود پڑا، عقل اس آزمائش سے کامیابی کے ساتھ

عہدہ برآ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، وہ تو دوسرے کو آگ میں
پھینکنے کے متعلق بھی تجاویز سوچنے میں دیر تک ڈوبی رہی اور پھر بھی
کوئی فیصلہ کن نتیجہ پہ آمد نہ کر سکی، اگر اس کا اپنا معاملہ ہوتا تو وہ آگ کی
ہولناکیوں کو دور ہی سے دیکھ کر جان دے دیتی۔ حضرت ابراہیم علیہ
السلام اگر اس امتحان میں پڑنے کے لئے عقل کی امداد لیتے اور عقل
سے فیصلہ طلب کرتے تو شاید کبھی آگ میں کودنے کی جرأت نہ کرتے
کیونکہ عقل انہیں آگ کی ہولناکی اور حرارت کی شدت سے خوفزدہ کر دیتی
اور اس میں گر پڑنے کی جرأت سے باز رکھتی لیکن آپ عقل کی رہنمائی کی
طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ آپ نے عقیدت کے اشارے پر کام کیا اور کامیاب
ہو گئے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں ؎

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی!

عقیدت کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ معشوق کے ہر
ارشاد پہ بلا حیل و حجت تسلیم و رضا کا اظہار کرتا ہے، وہ یہ دیکھنے کی طرف
متوجہ بھی نہیں ہوتا کہ جو کچھ اُسے کہا جا رہا ہے، وہ غلط ہے یا صحیح، جائز
ہے یا ناجائز اور حق و صداقت پہ مبنی ہونے کی وجہ سے قابلِ عمل ہے
یا کذب و افترا کی بنا پہ ناقابلِ عمل! اس کا ایمان یہ ہے کہ اپنے معشوق
کے فرمان پہ ہر وقت عمل و خدمت کے لئے کمربستہ رہے اور حکم
ملتے ہی سرِ نیاز خم کئے ہوئے تعمیل میں مصروف ہو جائے۔ اس شعر میں
عقیدت کے اسی انتہائے کی وضاحت کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:۔
عقیدت اپنے تقاضائے فطری کی وجہ سے قاصد کے پیغام دیتے

ہی عمل کرنے کے لئے تیز رفتاری سے چل دیا کیونکہ اس کا امتیازی وصف یہی تھا کہ حکم مانے۔ یہ سمجھنا اس کے اصول کے خلاف ہے کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے؟ لیکن اس کے بالمقابل عقل ابھی تک اس پیغام کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکی۔ کیونکہ اس کا شیوہ ہی یہ ہے کہ ہر ایک بات کو جو اس کے کانوں تک پہنچے، سب پہلے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے اور بغیر سوچے سمجھے کسی عملی کوشش کے لئے آمادہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی آزمائش کو ابھی عقل سمجھ ہی نہ سکی تھی کہ یہ کس مقصد سے نازل ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا مگر عقیدت نے فوراً بھانپ لیا کہ اس ابتلا کا مقصد دراصل یہ ہے اور وہ سرگرم عمل ہو گیا۔

نفسیاتی نقطہ نظر سے کامیابی اور ناکامی کا اصول معیار بھی یہی ہے کہ حکم سنتے ہی بلا سوچے سمجھے تعمیل کرنے والا، اس کی نسبت سے جو حکم کو سن کر اس کے حسن و قبح پر غور کرنے کے بعد عمل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ حکم دینے والے کی نظروں میں زیادہ مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ سوچنے والا جب تک تعمیل کرنے کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے، فوراً عمل کرنے والا اس وقت تک کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا لیتا ہے۔ تو نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک عقل غور و فکر کرنے کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچیگی، عقیدت جو اشارہ پاتے ہی سرگرم عمل ہو چکا ہے، منزل مقصود پہ پہنچ جائے گا۔ چنانچہ اس لحاظ سے عقیدت کا مرتبہ عقل سے بہت ہی بلند ہے اور یہی باعث ہے کہ مقام عقل پہ پہنچنا تو کچھ مشکل نہیں

مگر مقامِ عقیدت کا حاصل کرنا محالات میں سے ہے اور اس کی تصدیق شاعر نے اپنے ذاتی تجربہ سے کی ہے۔

مقامِ عقل سے آسان گذر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

اقبالؔ، عقل کے مقام کو نہایت آسانی کے ساتھ طے کر گیا یعنی اس منزل سے گذرنے کے لئے اُسے کوئی تکلیف اور کوئی دقت نہ اُٹھانی پڑی مگر اس سے آگے جاکر جب مقامِ شوق یعنی عقیدت کی منزل شروع ہوئی تو وہ عقل کے مدارج پر عبور رکھنے اور فرزانگی و دانشمندی کا مرتبہ حاصل ہونے کے باوجود بھی اس عالم سے بھٹک گیا اور ایسا کھویا کہ پوری تلاش و جستجو کے بعد بھی مقصد تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا جب تک کہ اُسے کسی رہنمائے طریقت نے راستہ سے آگاہ نہ کیا۔

اس مشاہدہ کی بنا پر اقبالؒ بلاخوف تردید اعلان کرتا ہے کہ جو لوگ عقل کو رہنما خیال کرتے ہیں، وہ ایک بے خود غلط راستہ پر جا رہے ہیں اس لئے کسی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ حقیقت کا علم رکھنے والی طاقت ایک اور ہے ؎

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

اگر زمانہ عقل کو مشعلِ راہ سمجھے ہوئے ہے تو یہ اس کی نادانی ہے، وہ یہ خبر نہیں رکھتا کہ عقیدت کی وحشت اور محبت کا جنون بھی ایک طاقت ہے جو جادۂ حقیقت اور منزلِ مقصود کا فہم رکھتی ہے۔ اگر انہیں یہ معلوم

سو تو وہ کبھی عقل کا سہارا نہ تلاش کریں کیونکہ وہ تو جلوۂ حق کو دیکھنے والی آنکھ ہی نہیں رکھتی اور انسان کی تخلیق دراصل اسی مقصد کی تکمیل کے لئے ظہور میں لائی گئی ہے۔ اس لیے اس کا محض عقل و خرد کے زیور سے مزین ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک کہ وہ بندۂ عقیدت ہو کر قرب الٰہی کا ذوق نہ پیدا کرے ؎

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

اے انسان! تیری خاک میں جلوۂ حقیقی کا ذوق بھی پوشیدہ ہے اس واسطے تو صرف اسی غفلت میں مت پڑا رہ کہ فہم و ادراک اور عقل و دانش کا حصول تیری تکمیلِ انسانیت کے لئے کافی ہے۔ اگر تو اسی یقین میں محو رہیگا تو یہ تیری کوتاہی کا ثبوت ہے جس سے تو غافل سمجھا جا سکتا ہے۔ تیرا فرض ہے کہ اس غفلت و محرومی کا احساس کرے اور عین ذات کو دیکھنے والی آرزو کو پورا کرنے کی فکر میں لگ جائے۔ اگر تو نے غور کیا تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ خواہش کوئی خارجی چیز نہیں، یہ ذوق کسی دوسری دنیا سے تیرے سامنے نہیں آئے گا تیری سرشت ہی میں موجود ہے، تیری اسی مشتِ خاک میں چھپا ہوا ہے۔ اس کو دیکھنا اور سمجھنا تیرا کام ہے۔

اس شعر میں بھی یہی اشارہ مضمر ہے کہ عقل و ادراک کا جوہر ذوقِ تجلی کے اظہار سے بالکل محروم ہے کیونکہ اس میں صداقت کی روح موجود نہیں بلکہ اس کی ہستی چالاکی و عیاری کا ایک خوشنما مظہر ہے اور منزلِ مقصود پہ وہ چیز پہنچا سکتی ہے جو راستی کی حامل ہو ؎

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

عقل عیاری کا ایک مرقع ہے۔ جو سینکڑوں روپ بدل کر دنیا کے سامنے آتی ہے اور اسے اپنی حیرت انگیز جدت طرازیوں سے مسحور و مبہوت بنا دیتی ہے وہ اپنی چالاکی سے ایسے ایسے منظر، نگاہ انسانی کے سامنے پیش کرتی ہے کہ انسان اسی کو سب کچھ سمجھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس عیار طاقت پر قبضہ حاصل کر لینا ہی کمال انسانیت کی دلیل ہے حالانکہ حقیقت حال یہ سے بہت مختلف ہے۔ اس کے برعکس عقیدت ایک ایسی صادقانہ ہستی کا مالک ہے جو عقل کی طرح نہ ملا بن سکتا ہے، نہ زاہد اور نہ حکیم۔ جس طرح عقل اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں سامنے لاتی ہے کبھی ملا بن کر منبر پر خطبہ دیتی ہے، کبھی زاہد کی صورت اختیار کر کے سجادہ و تسبیح میں منہمک نظر آتی ہے اور کبھی حکیم بن کر کیمیاوی مرکبات بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اس طرح عقیدت کوئی شکل اختیار نہیں کرتا کیونکہ اس کا مدعا دنیا والوں کو اپنے کمالات علمیہ سے متحیر کرنا نہیں اور نہ فریب کاری کر کے کسی سے کچھ حاصل کرنا مقصود ہے مگر عقل چونکہ ہوس کی غلام ہے اس لئے وہ اپنی تشنگی کو دور کرنے کے لئے قسم قسم کی عیاریاں کرتی ہے طرح طرح کے بہروپ بھرتی ہے مگر پھر بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی اس سبب سے کہ وہ عقیدت کی برکتوں سے محروم ہے۔ اگر اپنے آپ کو عقیدت کے قدموں میں ڈال دے تو فریب ہوس سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہو جائے۔

دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام
عشق گرہ کشا کا فیض نہیں ہے عام ابھی

علامہؒ فرماتے ہیں کہ صرف عقل ہی لالچ کی غلام نہیں بلکہ اس کے ساتھ دین اور علم و فن بھی ہوس کی بندگی اور اطاعت میں مشغول ہیں۔ عقل والے اپنی نکتہ طرازیوں اور ایجادات سے ساری دنیا پر قبضہ جما لینا چاہتے ہیں، دینی لوگ اپنے زہد و اتقار اور ذکر و فکر کا سکہ بٹھا کر اہل جہاں کو اپنا غلام بنانے میں محو ہیں اور علم و فن کے ماہر اپنے کمالات سے کائنات کی ہر چیز کو قدموں میں ڈال دینے کی فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں غرض تمام کے تمام ہوس کے بندے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عقدوں کو کھولنے والے عقیدت کا فیض ابھی عام نہیں ہوا۔ جب اس کا فیض عام ان قوتوں پر مسلط ہو جائے گا تو انہیں ہوس کی غلامی سے خود بخود نجات مل جائے گی عقیدت کے بغیر کوئی چیز اس عقدہ کو حل نہیں کر سکتی۔

رسائی منزل سے عجز و محرومی کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے سالک راہ کو عقل کی رہنمائی سے محترز نہ رہنے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ؎

رہنے دے جستجو میں خیال بلند کو
حیرت میں چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو

یہاں سالک کو مخاطب کر کے ہدایت دی گئی ہے کہ:-

خیال کی بلند پروازیوں کو اسی تلاش میں رہنے دے جس میں وہ لگا ہوا ہے۔ یعنی اپنی بلند خیالی کو اسی چیز کی جستجو میں پڑا رہنے دے جس میں وہ منہمک ہے۔ تو اس کی طرف توجہ نہ کر کیونکہ جو کچھ وہ ڈھونڈھ کر لائے گا

نہ تیرے کام کی شے نہیں اور نہ تجھے اس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ علم و حکمت کو پسند کرنے والی آنکھ کو حیرانی میں چھوڑ دے کیونکہ وہ بھی تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ یہاں یہ حقیقت صاف طور پہ عیاں ہو گئی کہ علم و حکمت کی دماغ سوزی حیرت و استعجاب کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتی۔ انسان جس قدر اس کی وسعتوں میں بڑھیگا، اس کی حیرانی بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتی چلی جائے گی۔ اس نکتہ کو ایک اور شعر میں یوں واضح کیا گیا ہے ؎

اک دانش نورانی، اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

یعنی دانش دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک نورانی اور دوسری برہانی۔ نورانی دانش وہ ہے جو نور کے آغوش میں پرورش پاتی ہے اور عالم نور ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس دانش سے مراد عقیدت ہے۔ دانش برہانی وہ ہے جو دلائل کے گہوارہ میں پلتی ہے اور ہر چیز کا تجزیہ دلائل ہی کی بنا پہ کرتی ہے گویا اس کی ہستی دلیل بازی پہ ہی موقوف ہے۔ اس دانش کا مطلب عقل ہے۔ تو فرمایا، عقل حیرانیوں کی کثرت کا دوسرا نام ہے۔ اس سے ڈھونڈنے والے کو تعجب کے سوا کچھ نہیں مل سکتا۔ اس لئے ؎

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ تیرا

مجھے چشم حکمت کے بکھیڑوں سے کیا کام جب کہ میں یہ نہایت اچھی طرح معلوم کر چکا ہوں کہ یہ مجھ کو کو مراد تک نہیں پہنچا سکتے۔ میرا مقصد جلوہ بے نقاب کی دید ہے اور یہ حکمت کی آنکھ کبھی نہیں دیکھ سکتی پھر مجھے اس

کی الجھنوں میں پڑنے سے واسطہ اس لئے اے پھول! میں تیرے نظارہ کی دید بلبل کی آنکھ سے کرتا ہوں کیونکہ وہ محبت کی آنکھ ہے۔ بلبل کو چونکہ جمال گل کا عاشق شیدا خیال کیا جاتا ہے اس بنا پر اُسکی آنکھ محبت کی آنکھ ہے جو جلوۂ محبوب کو بے نقاب دیکھتی ہے۔ اس آنکھ میں جذبۂ عشق نے یہ جوہر پیدا کر دیا ہے کہ اپنے معشوق کے حسن و رعنائی کا نظارہ کر سکے لیکن حکمت کی آنکھ اس نعمت سے محروم ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ جب میں نے چشم حکمت کو حصولِ نظارہ کا کامیاب ذریعہ نہیں پایا بلکہ حیرانی کا مرکز معلوم کیا ہے تو پھر میں اس سے سروکار کیوں رکھوں اور اس کے قضیوں میں اُلجھنے سے مجھے کیا حاصل؟ میں جلوۂ دیدار کو محبت کی آنکھ سے دیکھتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس مقصد کی تکمیل کا بہترین وسیلہ یہی ہے۔ عقل اور حکمت کی تحقیق تو صرف نظری و خبری معلومات تک محدود ہے مگر ان میں ایک عاشق کے لئے سکون و اطمینان کا کوئی سامان موجود نہیں۔

دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

خود بھی دیکھا اور دوسروں کو بھی اپنے مشاہدات سے آگاہ کیا، عقل و خرد کی تحقیق و تدقیق کا حال لوگوں کو سنایا بھی اور ان سے اس عالم کا تذکرہ سنا بھی لیکن نتیجہ نے اسی فیصلہ پر پہنچایا کہ دل کی تسلی نظر و خبر دونوں ہی میں موجود نہیں، وہ عشق ہی کے فیض سے حاصل ہو سکتی ہے۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

شکتی یعنی قوت اور شانتی یعنی سکونِ قلب مردانِ خدا کے نغموں میں ہے۔ بھگت سے مراد وہ لوگ ہیں جو عشق حقیقی سے لبریز ہو کر خدا کی یاد اور ذکر و فکر میں محو رہتے ہیں۔ تو علامہؒ فرماتے ہیں کہ اصل طاقت اور دل کا اطمینان عاشقانِ الٰہی کے گیتوں میں ہی مل سکتا ہے کیونکہ وہ محبت کے پروانے ہیں اور زمین کے رہنے والوں کی نجات کا راز بھی پریت یعنی محبت ہی میں پوشیدہ ہے۔ اس کے بغیر نہ انہیں دل کی تسلی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ نجات!

عشق و محبت ایک ایسی لازوال دولت اور ایک ایسی حیات آفرین اکسیر ہے جو ہر پستی کو بلندی میں تبدیل کر دیتی ہے اور ہر تاریکی کو روشنی بنا دیتی ہے۔ یہ ہر مرض کا علاج اور ہر درد کا درمان ہے۔ بنی نوع انسان کی روح اسی سے بالیدگی حاصل کرتی ہے اور اسی سے زندگی کا جوہر پاتی ہے۔ اقبالؒ نے ان حقائق کو کس لطیف انداز بیان میں پیش کیا ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

آپ مسلمان کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ اے فرزند توحید! عشق کی قوت سے کام لے کر ہر پستی کو بلندی بنا دے۔ یہ قوت اپنے اندر اس انقلاب کا جوہر بقدر وافر رکھتی ہے کہ گہرائیوں کو اونچائیوں میں بدل دے۔ اگر تو اس قوت کو استعمال میں لائے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ نشیب اپنی حالت کو چھوڑ کر فراز نہ بن جائیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے نور سے جہاں میں روشنی پھیلا دے۔ یہ مقدس نام اس طاقت کا حامل ہے کہ اگر تو نے اسے اونچا کرنے، اسے پھیلانے اور اس کا سہارا لینے

کی کوشش کی تو اس کی روشنی سارے عالم کو منور کر دے گی۔

محبت سے ہی پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیمار قوموں نے محبت ہی سے شفا پائی ہے اور جن قوموں کی تقدیر سوئی ہوئی تھی، ان کو محبت ہی سے بیداری حاصل ہوئی۔ یعنی قوموں کی اجتماعی مرضوں کا علاج بھی محبت ہی ہے اور ان کی سوئی ہوئی قسمت کو جگانے کا ذریعہ بھی محبت ہی ہے۔ اسی سے بیمار قومیں شفا حاصل کرتی ہیں اور اسی سے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار کرتی ہیں گذشتہ اقوام کی مثال شاہد ہے کہ انہوں نے تمام امراض کو اکسیرِ عشق سے دور کیا اور اپنی سوئی ہوئی تقدیروں کو محبت ہی کی قوت سے جگایا۔

شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

محبت وہ شراب ہے جو روحِ انسانیت کی پرورش کرتی ہے۔ یعنی نوعِ انسان کی روح شرابِ عشق ہی سے زندگی اور تربیت حاصل کرتی ہے اور اسی کے فیض سے اُس میں بڑھنے، پھولنے اور پھلنے کا جوہر نصیب ہوتا ہے ورنہ مخلوقِ عالم میں دوسری کوئی شئے ایسی نہیں جو انسان کی روحانیت کو اپنے آغوش میں پال سکے عشق کی شراب ایک ایسے ابدی سرور کی حامل ہے جو بادہ و ساغر کے بغیر ہی سرمستیوں سے لبریز کر دیتی ہے۔ انسان اس کے نشہ سے ایسا مخمور رہتا ہے کہ اُسے صراحی و پیمانہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی طبیعت ان چیزوں سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ مجھے اسی شراب نے

جام و سبُو کے بغیر مست و مخمور رہنا سکھایا ہے اور اب میں مے عشق سے اسقدر سرشار رہتا ہوں کہ مجھے نہ پیالے کی ضرورت ہے اور نہ صراحی کی احتیاج۔

لیکن عقل اس تمام رندی و سرمستی کے جوہر سے عاری ہے کیونکہ اس کا تسلط صرف علوم مادیات تک محدود ہے، روحانیات کے اسرار و رموز سے اُسے کوئی واقفیت حاصل نہیں۔

وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

عشق اُن لوگوں کا مذہب ہے جو اپنی حقیقت سے آگاہ اور ذوق جلوہ سے مخمور ہیں اور عقل اُن کا ایمان ہے جو ملا بننے کے خواہشمند ہیں اور جمادات و نباتات یعنی پتھروں اور سبزہ زاروں کا علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ روحانیت کی طرف توجہ نہیں کرتے کیونکہ اُن کا اعتقاد اس کی ضرورت کا انہیں یقین نہیں دلاتا، وہ اپنے لئے اسی کو کافی سمجھتے ہیں کہ جمادات اور نباتات و جمادات کے علوم میں کمال پیدا کر لیا جائے۔ مگر اہل عشق اُن کے اس مذہب کو ایک گمراہی اور محرومی خیال کرتے ہیں اور اس سے کنارہ کشی کر کے عشق ذات اور شوق دید پہ اپنی تمام کوششیں مرکوز کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسی پہ ایمان رکھتے ہیں اور یہی ان کا مذہب ہے

مردان عشق کا یہ اعتقاد بے شمار درخشندہ حقائق پہ مبنی ہے کہ انسان کی آفرینش کا اصل مدعا عالم محبت کی واقفیت بہم پہنچانا اور اس کی برکات سے فیضیاب ہونا ہے اس لئے اُسے فریب عقل کی اس ہوشربا دنیا میں کھو کر جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اپنے مقصد

کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ کسی اور عالم کے لئے اس طلسمکدہ میں لایا گیا ہے اسی بنا پر اہل عشق دنیا والوں کو انتباہ کرتے ہیں ؎

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش!
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

اے صاحب ہوش، اے دنیائے عقل کے رہنے والے، انہی صبح و شام کے مناظر میں کھو کر نہ رہ جا جو بے شمار نیرنگیوں کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے تجھ پر سے گذرتے ہیں اور جو لاتعداد اعجوبہ کاریوں کو دامن میں چھپائے تیرے سامنے آتے ہیں، بلکہ اُس عالم کی تلاش کر جس میں فردا و دوش کوئی معنی نہیں رکھتے، جہاں نہ کل کا ظہور ہے اور نہ آج کا وجود۔ وہ جہاں زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز ہے اور یہی وہ مقام ہے جس میں تجھے گنجِ مراد دستیاب ہو سکتا ہے۔ آج اور کل اور صبح و شام والی دنیا میں تجھے کچھ نہیں مل سکتا اس لئے اس کی سحر آرائیوں میں ڈوبا رہنے کی کوشش نہ کر ورنہ بھٹک جائے گا کیونکہ یہ عالم رازِ حقیقت کی خبر دینے والا نہیں، بھٹکے ہوئے لوگوں کا مرکز ہے رازِ حقیقت تجھے دنیائے محبت ہی میں مل سکے گا اور اُسے پانے کی ترکیب یہ ہے کہ ؎

دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر
نور سے جس کے ملے رازِ حقیقت کی خبر

تیرے دل میں سوزِ محبت کی چھوٹی سی چنگاری موجود ہو جس کی چمک حقیقت کے راز کو منور کر دے۔ اس لئے تو اپنے دل میں حرارتِ

عشق کا ایک ایسا شرار پیدا کہ جس کا نور تجھے راز حقیقت سے خبردار کر دے جس کی روشنی اس راز کو تیری آنکھوں کے سامنے لے آئے اور تو اُسے کامیابی سے حاصل کر سکے۔ عقل کا سہارا مت لے وہ تو بجائے خود ایک حیرانی ہے جو اپنی اچھائی اور برائی کے متعلق بھی کوئی علم نہیں رکھتی۔

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

عقل نیک و بد کو دیکھنے کا شعور نہیں رکھتی۔ وہ یہ نہیں جانتی کہ اس کا فلاں نظریہ نیکی کے نتائج پہ محمول ہے یا بدی کے اثرات سے لبریز ہے، فلاں نکتہ اپنے اندر اچھائی کا پہلو رکھتا ہے یا بُرائی کا۔ وہ اپنے علم و کمال کی بنا پر مختلف النوع خیال آرائیوں اور موشگافیوں میں مشغول ہے اپنے تجربات و مشاہدات کے دلائل سے گوناگون نکتہ طرازیاں کرتی ہے مگر اُسے یہ خبر نہیں کہ اس کے یہ تمام فیصلے نیک ہیں یا بد، اچھے ہیں یا بُرے، ظالم اپنی حد سے بڑھتی جا رہی ہے اور ہر چیز کے متعلق قیاس آرائیوں میں محو ہے۔ یہ نہیں دیکھتی کہ کونسی شے اُس کے تجزیہ کے قابل ہے اور کونسی ناقابل۔ سب پر اپنا عمل کئے جا رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُسے نیک و بد کی تمیز نہیں۔ پھر جس کو اپنی کوششوں کے نتائج کی اچھائی یا برائی کے متعلق ہی کوئی واقفیت میسر نہیں، وہ دوسروں کی رہنمائی کیا کر سکتی ہے اور اس میں یہ اہلیت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ اپنے سے کسی بالاتر مقام کی نسبت کوئی صحیح خبر بہم پہنچا سکے؟

ایک جگہ پر علامہ اقبال عشق کے مدارج بیان کرتے ہوئے

فرماتے ہیں کہ عقل دراصل عشق کی زوالی کیفیت کا نام ہے یعنی عشق کا تنزل، عقل کے ارتقا کی دوسری صورت ہے۔

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی

عشق و مستی کی قوت جہاں بے نقاب ہو کر اپنے جمالیاتی مظہر کا اظہار کرتی ہے، وہاں سازِ زندگی سے وہ وجد آور ترانے اور جنون آفریں نغمے پیدا ہوتے ہیں جو فضا کو کیف و سرور سے معمور کر دیتے ہیں۔ نے نوازی کی اصطلاح اہلِ معرفت کے ایک گہرے مسئلہ سے تعلق ہے اور اس سے مراد عاشقانِ حقیقت کا محویت عشق میں ڈوب کر زندگی کا ساز بجانا اور اس سے محبت کا وہ ترانہ پیدا کرتا ہے جو ان کی سرمستی و سرشاری پر بیخودی کی ایک مسلسل کیفیت طاری کر دے۔ نے کا یہ صوفیانہ تخیل سب سے پہلے مولائے رومؒ نے پیش کیا ہے۔ چنانچہ آپ اپنے رفیع الشان اور لاجواب صحیفہ مثنوی کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کرتے ہیں

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند!

یہ شعر مثنوی مولینا رومؒ کا مطلع اور عرفانیات کے ایک دقیق نکتہ کا حامل ہونے کی وجہ سے لازوال تاریخی حیثیت اور کبھی نہ مٹنے والی دوامی شہرت رکھتا ہے شارحین مثنوی نے مختلف مطالب و معانی سے اس کی تشریح کی ہے جو ہمارے موضوع کلام سے خارج ہے اس لئے ہم اپنے سلسلہ بحث پہ آتے ہیں۔

چونکہ علامہ اقبالؒ نے علم و حکمت عشق و معرفت اور فقر

وغنا ہر چیز میں اپنے روحانی پیر طریقت مولینا رومیؒ کی ظاہری و باطنی راہنمائیوں سے استفادہ کیا ہے، اس لئے نے نوازی کی رمز بھی انہی کے محاورہ میں عشق و مستی کی جمالی حالت کے مظہر کے طور پر بیان کی گئی ہے یعنی عشق و مستی کی عریاں تصویر، اہل حال کے عمل نے نوازی کے لباس میں جلوہ نما ہے۔ اور عشق و مستی کا جلال یعنی بزرگی و وقار عاشقانِ حق اور عارفان راز کی بے نیازی کی صورت میں عیاں ہے۔

کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ

زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

عشق و مستی کے کمال کا نمونہ حیدر کرار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ظرف ہے یعنی عشق و مستی کی کیفیت جب کمال کے درجہ پہ پہنچ جاتی ہے تو وہ حضرت علیؓ کا سا عزم و ہمت فراخدلی اور بلند حوصلگی پیدا کر دیتی ہے گویا آپ کا ظرف، آپ کی بڑائی عشق مکمل اور سرشاریٔ محبت کی آئینہ دار ہے اور عشق و مستی کا زوال یہ ہے جو رازی کی خرد و حکمت کے طور پر ظاہر ہوا۔ مطلب یہ کہ جہاں عشق و مستی کا زوال اپنی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے یعنی جہاں ان چیزوں کا وجود ہی موجود نہیں ہوتا، وہاں عقل و دانش کا طلسم کار فرما ہوتا ہے جو زینت اوراق ہو کر رہ جاتا ہے اور اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ۔

حکیم رازی کی علمی ہنگامہ آرائیوں کا

لفظی ذخیرہ جیسے کتابوں کے سوا

کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا۔ یہ شہرۂ آفاق حکیم چونکہ زمرِ عشق کے اثرات سے بے بہرہ اور محض بندۂ عقل تھا

اس لئے اس کی تمام کاوشیں کاغذی پھولوں تک محدود رہیں جو حقیقت کی خوشبو سے قطعاً محروم ہیں۔ لیکن اگر وہ معارف عشق سے بھی آشنا ہوتا تو موجودہ فانی شہرت کے علاوہ غیر فانی ناموری اور سربلندی بھی اس کے قدم چومتی۔ کیونکہ عشق ہی وہ جادو ہے جو ہر شے پر غالب ہے۔

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

یہاں ایک تاریخی مجادلہ کے ذکر سے عقل کی مغلوبیت اور عشق کی ہمہ گیر فتح کا ثبوت دیا گیا ہے اور اس انتباہ کے ساتھ کہ اپنے آپ کو ایسے ہتھیار سے مسلح رکھنا ضروری ہے جو سالکان راہ کو موجودہ عقل وخرد کی جادوگری سے بہ حفاظت نکال لے جائے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ دانش حاضر نے اپنی حیرت آفرینیوں سے پھر وہی پرانا طلسم نئی شکل میں تازہ کر لیا ہے جو فرعون نے اہل حقیقت سے مقابلہ کرنے کے لئے پھیلایا تھا۔ یہ طلسم ایسا خوفناک ہے کہ اس زمانہ سے عصائے موسوی کے بغیر گذرنا ناممکن ہے۔ یہ موجودہ دنیا کے لئے ایک زبردست انتباہ ہے۔

چوب کلیم کا مطلب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی ہے۔ یہ لکڑی آپ کا عصا تھا جس سے آپکو چلنے پھرنے میں مدد حاصل تھی اور کلیم آپ کا لقب ہے۔ چونکہ آپ کوہ طور پہ جا کر خدا سے ہمکلام ہوا کرتے تھے اس بنا پر آپکو کلیم اللہ کے قابل احترام لقب سے ملقب کیا گیا۔ سحر قدیم سے چوب کلیم کے بغیر نہ نکل سکنے کے اشارہ کی تفصیل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس تاریخی واقعہ کو بھی ذہن نشین کر لیا جائے جو اس شعر کی اصل روح ہے۔ آیئے! اس واقعہ کا علم قرآن پاک کے بیانات

سے حاصل کریں:۔

ارشاد ہوتا ہے کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اچانک آگ کی روشنی نظر آئی۔ آپ گھر والوں کو یہ کہہ کر کہ ممکن ہے، اس آگ میں مجھے نورِ الٰہی مل جائے اس کے پیچھے چل دیئے۔ چلتے چلتے یہ آگ ایک ایسی وادی میں پہنچ گئی جو وادیٔ مقدس کے نام سے اس لئے مشہور تھی کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کئی انبیائے کرام کا ظہور بھی اسی جگہ ہوا تھا۔ جب موسیٰ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ سفید آگ (یہاں سفید آگ لکھ کر قرآن حکیم نے اس حقیقت کو آشکار کر دیا ہے کہ یہ نورانی آگ تھی اس لئے اس کی روشنی سفید تھی) ایک درخت پر روشن ہے۔ معاً اوپر سے آواز آئی کہ "اے موسیٰ! میں تیرا رب ہوں اور میں نے تجھ کو اپنا رسول بنانے کے لئے منتخب کر لیا ہے۔" پھر چند ضروری اطلاعات و معلومات کا ذکر کر کے فرمایا، یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟" آپ نے جواب دیا، "میرا عصا، جس کو ٹیک کر میں چلتا پھرتا ہوں!" یہی وہ لکڑی تھی جس کو چوب کلیم سے موسوم کیا گیا ہے۔ تو حکم ہوا "اس کو زمین پر پھینک دے۔" موسیٰ علیہ السلام نے وہ عصا زمین پر پھینک دیا جو گرتے ہی ایک بہت بڑا اژدہا بن گیا۔ موسیٰ اس کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے اور ادھر اُدھر بھاگنے لگے مگر خدا نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ ڈرو مت، اس کو پکڑ لو! یہ پھر اپنی اصل حالت پر آ جائے گا۔" آپ نے ایسا ہی کیا اور وہ اژدہا آپ کا ہاتھ چھوتے ہی عصا بن گیا۔ اس وقت سے اس لکڑی میں یہ معجزانہ کیفیت پیدا ہو گئی کہ ضرورت کے وقت زمین پر پھینکنے سے سانپ بن جاتی اور موسیٰ علیہ السلام کے پکڑتے ہی عصا بن جاتی۔

یہاں پر بسبیل ارتجال مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ آج مجھے پہلی مرتبہ ایک دانائے راز کے اس قول پر عملی طور سے ایمان لانے کا موقعہ ملا ہے کہ کلام اقبال کو سمجھنے کے لئے تاریخ عالم کے مدنی و معاشی، قومی و اجتماعی اور مذہبی و معاشرتی ہر قسم کے واقعات کا نہایت گہرا مطالعہ حاصل ہونا بے حد ضروری ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ فرض کیجئے چونکہ مذکورہ بالا واقعہ سے چوب کلیم کی حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ ہم اس تذکرہ کو یہیں ختم کر کے اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں تو اس صورت میں شعر کا اصل مقصد عیاں نہیں ہوتا کیونکہ ابھی تک یہ امر سامنے نہیں آیا کہ سحر قدیم پر عصائے کلیم نے کیا غلبہ حاصل کیا جس کی بنا پر عہد جدید کے سحر سے اس لکڑی کا بے بغیر گذرنا خارج از امکان ٹھہرایا گیا ہے؟ یہ عقدہ تو اسی وقت کھل سکیگا جبکہ چوب کلیم اور سحر قدیم کے معرکہ کی پوری تفصیل معلوم ہو جائے کیونکہ اس شعر کی اصل بنیاد یہی ہے۔ لہٰذا اس کی واقفیت اشد ضروری ہے۔

خداوند عالم نے حضرت موسیٰؑ کے عصا میں یہ اعجاز ودیعت کر کے فرمایا "اے موسیٰ! اپنا دایاں ہاتھ بغل میں دباؤ اور باہر نکالو!" موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل کی اور جب ہاتھ باہر نکالا تو وہ الوہیت کے نور سے چمک رہا تھا۔ ارشاد ہوا، موسیٰؑ! یہ تیری نبوت کا ایک منور نشان ہے جو تیری سچائی پر نورانی روشنی ڈالتا رہے گا۔

عصا اور ید بیضا کے ان دونوں معجزوں کے بعد خدا نے حضرت موسیٰؑ کو چند اور معجزے بھی عطا کئے اور آپ کی چند دعاؤں کو بھی قبولیت

کا شرف بخشا اور پھر حکم دیا کہ اے میرے نبی! اپنے بھائی ہارون کو جو تیری خواہش اور مطالبہ سے تیرا مددگار بن گیا ہے، ساتھ لے کر فرعون کے پاس جاؤ! وہ بڑا سرکش اور مغرور ہو گیا ہے اس لئے تم اُسے ہدایت اور سیدھے راستے کی طرف بلاؤ اور اگر وہ تمہاری رسالت کو تسلیم نہ کرے تو یہ معجزے دکھاؤ جو تمہیں بخشے گئے ہیں۔ اس کام میں کوتاہی ہر گز نہ کرنا! جاؤ!

موسیٰ علیہ السلام واپس آئے اور اپنے بھائی ہارون کو ہمراہ لے کر فرعون کے پاس گئے۔ آپ نے فرمان الٰہی کے مطابق فرعون کو توحید و رسالت پر ایمان لانے اور شرک و کفر سے توبہ کرنے کی دعوت دی مگر اس نے انکار کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام سے دلائل نبوت پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ جس پر آپ نے عصا کے معجزہ کے علاوہ تمام معجزے ایک ایک کر کے دکھائے لیکن فرعون نے اس کے باوجود بھی نہ صرف انکار کیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جادوگری کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہنے لگا کہ تم اپنی سحر کاریوں سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتے ہو؟ کیا تمہارا یہ ارادہ ہے کہ ان شعبدہ بازیوں سے ڈرا کر ہمیں سرزمین مصر سے نکال دو؟ اگر یہ بات ہے تو ہم بھی خوف کھانے والے نہیں ہیں۔ آؤ! ہم سے دن اور مقام مقرر کر و جہاں تمہارا مقابلہ ہو، تم اپنی جادوگری کے جوہر دکھاؤ اور ہم اپنی سحر کاری کے جوہر دکھائیں گے۔ پھر دیکھا جائیگا کہ تم سچے ہو یا ہم اور ہم بڑے ساحر ہیں یا تم ہو۔ تم خود ہی اپنی پسند کے مطابق جگہ اور دن کا فیصلہ کر دو!

چنانچہ وہیں ایک میدان منتخب کر لیا گیا اور قرار پایا کہ جشن نوروز

کا دن مقابلہ کے لیئے بہتر ہے تاکہ عوام و خواص اس میں شامل ہو سکیں۔
اس فیصلہ کے بعد جانبین اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو کسی اہتمام کی ضرورت نہ تھی کیونکہ نصرت الٰہی
ہر وقت آپ کے شامل حال تھی اس لیئے آپ تو خاموشی سے مقررہ
وقت کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن دوسری طرف فرعون، اس مقابلہ
کی کوششوں میں نہایت سرگرمی سے مشغول ہوگیا۔ اس نے اپنے
حلقہ اثر کے تمام جادوگر جمع کیئے اور ان میں سے بہتّر چوٹی کے بڑے
جادوگروں کو تیاری کرنے کا حکم دے دیا۔
حتیٰ کہ جشن نوروز کے دن ایک طرف سے نورِ حق کا شیدائی،
تائیدِ ایزدی کے سایہ میں اپنے بھائی ہارون کو ساتھ لے کر میدان مقررہ
میں جلوہ افروز ہوگئے۔ اور دوسری جانب سے فرعون اپنے جادوگروں
کے لشکر اور مشرکین کے ہجوم کی معیت میں آدھمکا۔ جب فریقین کا سامنا
ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پھر ایک دفعہ ہدایت کی طرف آنے کو
کہا مگر فرعون نہ مانا اور کہنے لگا کہ اے موسیٰ! بتاؤ کہ پہلے تم اپنا وار
کرنا چاہتے ہو یا ہم کریں؟ آپ نے فرمایا "پہلے تم ہی وار کرو"۔ یہ سنتے
ہی فرعونی ساحروں نے اپنے اپنے ڈنڈے اور رسیاں میدان میں
ڈال دیں۔ یہ ایک جادو کا وار تھا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو
ایسا معلوم ہوا گویا وہ فضا میں اڑنے لگے ہیں۔ آپ نے گھبرا کر اللہ
سے پناہ مانگی۔ اس کے ساتھ ہی خدا نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ گھبراؤ
مت! تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور یہ جو تمہارے ہاتھ میں ہے، یعنی
اپنی لکڑی (چوبِ کلیم) اسے زمین پر پھینک دو! آپ نے ارشاد

باری کا اشارہ پاتے ہی اپنا عصا زمین پھینک دیا، جو گرتے ہی ایک دہشتناک اژدہا کی شکل بن کر تمام رسیوں اور ڈنڈوں کو نگل گیا۔ یہ حالت دیکھ کر تمام مشرک کانپ اُٹھے اور موسیٰ علیہ السلام کے قدموں پہ گر گر پکارنے لگے کہ موسیٰ! تیرا خدا سچا ہے اور تیری نبوت بھی برحق ہے۔

یہ تھی وہ چوب کلیم جس نے کفار کی سحر آرائی سے موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کی اور ایک عاشق صادق کو حکمت و دانش کے لاتعداد ہیرستاروں پہ غالب کر کے حق و باطل کا معیار واضح کر دیا اور وہ تھا سحر تدبر جس نے رسولِ خدا کو زمین سے اٹھا کر فضا میں پہنچا دیا اور انہیں گھبرانے اور پریشان ہونے پہ مائل کر دیا۔ محققین کا خیال ہے کہ اگر تائید ایزدی سایہ فگن نہ ہوتی تو عجب نہیں تھا کہ موسیٰؑ اس فریب کاری سے مرعوب ہو جاتے۔

تو اس تاریخی حوالہ کی روشنی میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ موجودہ دانش نے پھر اسی پرانے جادو کو تازہ کر دیا ہے جس کا جال فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے اعلانِ صداقت کو جھٹلانے اور اپنی گمراہی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے پھیلایا تھا۔ یعنی وہی سحر کاری، عقلِ حاضر کے جدید نظریات و علوم کی بدولت، پھر ایک نئے روپ میں دنیا کے اندر پھیل گئی ہے اور جس طرح اُن جادوگروں کا الحاد، ایک اٹل حقیقت کے خلاف معرکہ آرا ہونے کے لئے اپنے علم و عقل کی تمام ساحرانہ قوتوں کو لئے ہوئے میدان مقابلہ میں آگیا تھا، اسی طرح دانش حاضرہ کا طلسم بھی اپنی گمراہی اور سرکشی کو راستی اور ہدایت کے بالمقابل صف آرا

کرنے کی غرض سے کائنات پہ چھا گیا ہے۔ وہ اپنی بلند پروازیوں کے بھروسہ پر باطل کی تصدیق اور حق کی تکذیب کرنا چاہتا ہے اور سارا زور اس بات پر صرف کر رہا ہے کہ نورِ حقیقت کی روشنی کو اہلِ جہاں پر اپنے علم و آگہی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ثابت کر دے اور اپنے معلومات کی وسعت سے قدرت کی سچی نشانیوں کو جھٹلائے۔

عقلِ جدید کا افسوں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی کوششوں کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتا اور اُس کی انہی جان توڑ سرگرمیوں کا نتیجہ ہے کہ سطحِ ارضی پر وہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے جو دریائے نیل کی وادیوں میں حضرت موسیٰ کلیم اللہ اور منکرین خدا کے درمیان پیدا ہو گئی تھی اور جس طرح ساحرانِ مصر کی شعبدہ گری داعیِ حق کے لئے خطرہ کا موجب بن گئی تھی، اسی طرح دانشِ حاضر کا جادو جو اپنی پُرانی شکل کو چھوڑ کر نئے لباس رونما ہوا ہے، اہلِ حق کے لئے خطرات و مصائب کا باعث بن گیا ہے۔ اس کی سحر کاریوں نے زمانہ کی فضا کو ایسا مسموم کر دیا ہے کہ صداقت پرستوں کے لئے سلامتی کا سانس لینا محال ہو رہا ہے۔ چنانچہ اُن کا اس عہد سے امن و امان کے ساتھ گذرنا ممکن نہیں جب تک کہ موسیٰؑ کے عصا کی سی طاقت رکھنے والی کوئی شے ان کے پاس حفاظت کے لئے موجود نہ ہو جو تمام طلسماتی حملوں کو نیست و نابود کر کے حق کو نصرت و کامیابی سے ہمکنار کر دے اور وہ شے عشق ہی کی طاقت ہے جو اہلِ حق کو خرد و حکمت کے موجودہ دور کی جادو طرازیوں کے اثر سے محفوظ رکھ سکتی ہے اور پھر چوبِ کلیم میں معجزہ پیدا کرنے کی وجہ بھی اصل میں عشق و محبت ہی کا تعلق تھا

خداوند عالم جس شکل میں چاہے، اپنے عشاق کی حفاظت کا انتظام کر سکتا ہے تاکہ وہ عقل و خرد کی فریب کاریوں اور افسوں سازیوں سے بچ رہیں مگر اس کی واحدانیت کا اعلان ہر گوشۂ کائنات تک پہنچائیں اور عشقِ حقیقی کی اہمیت کا پیغام فضائے عالم کے چاروں طرف پھیلائیں۔ ورنہ عقل و دانش کا جدید خاکہ ایک ایسا عذاب ہے جس سے بچ نکلنا آسان نہیں۔

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

فرماتے ہیں کہ میں دانشِ حاضرہ کے عذاب سے خوب واقف ہوں کیونکہ میں نے اس میں پڑھ کر دیکھا ہے۔ جس طرح ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے تھے، اسی طرح میں دانشِ حاضر کی آگ میں ڈالا جا چکا ہوں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ عقلِ جدید ایک بہت بڑا عذاب ہے جو انسانوں کی روحانیت کو فنا کر کے انہیں صرف مادیت کا غلام بنا دیتی ہے۔ چنانچہ اس کے منطق و فلسفہ نے بڑی بڑی عظیم الشان ہستیوں کو راہِ راست سے منحرف کر دیا، اس کی حب و سائنس نے بے شمار اہلِ نظر کو مہر دی و گمراہی کے خوفناک غاروں میں دھکیل دیا۔ دانشِ حاضر کی پیدا کی ہوئی تہذیب کو ہی دیکھئے کہ اس نے انسان کی اخلاقی و اقتصادی حالت کو کتنا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے، اس کی ذہنیت، اس کی غیرت و خودداری کو کس قدر پست بنا دیا ہے! پھر اس کے تمدن و معاشرت پر ایک نظر ڈالیے کہ اس کی حیرت انگیز، بلند پروازیوں اور تعجب خیز نکتہ طرازیوں نے اہلِ دنیا کو حقیقت سے کہاں تک دور پھینک دیا ہے! اب ریڈیو کے دلکش

نغمے یادِ خدا کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتے، رصدگاہ میں بیٹھ کر ستاروں میں بسنے والی مخلوق سے باتیں کرتے ہوئے یہ فرصت ہی نصیب نہیں کہ ستاروں کو بنانے والے کے حضور میں بھی چند لمحے گذار سکیں۔ کرۂ ارض کے فضا میں معلق ہونے کے اسباب کا تجزیہ اسرارِ حقیقت پر غور کرنے سے زیادہ قیمتی ہے اور ہزار ہا سجدے بھی اپنے اندر وہ لطف و سرور کی کیفیت نہیں رکھتے جو "پرِ چہرہ نسیم کے دلآویز رقص" اور "رنجیت سود کی لمن کے ایک زبردست شاہکار؟ ... کے ایک منظر میں موجود ہیں۔

پھر کیا نوعِ انسان کی اخلاقی گمراہی، اقتصادی تباہی اور روحانی بربادی کا اس تہذیب و تمدن سے بڑھ کر بھی کوئی ذریعہ ہے جسے دانشِ حاضر نے پیش کیا ہے؟ یہی باعث ہے کہ ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؒ نے اس دانش کو عذاب کی حامل قرار دیا ہے اور اُن کا یہ خیال سراسر حقیقت حال پر مبنی ہے کیونکہ عقلِ جدید نے علم و کمال کی جو روشنی پھیلائی ہے وہ بذاتِ خود ایک گمراہی اور تاریکی کے مترادف ہے ؎

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

اگرچہ یورپ میں علم و ہنر کی روشنی انتہا تک پہنچ چکی ہے اور اس نے مغربی لوگوں کے دل و دماغ کو حد سے زیادہ چمکا دیا ہے مگر حقیقت میں یہ روشنی ایک تاریکی ہے جس نے دنیائے یورپ کو اصل مقصد دیکھنے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچنے سے محروم کر دیا ہے۔ یعنی وہ تاریکی جس میں آبِ حیات کا چشمہ موجود نہیں بلکہ بے مقصد بھٹکنے کی دنیا ہے۔

چشمۂ حیوان کا مطلب ہے زندگی کا چشمہ یا زندگی بخشنے والے

پانی کا حوض جسے آب حیات کے چشمہ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور
اب اس کی حیثیت ایسی عمومیت اختیار کر چکی ہے کہ صرف آب حیات
کہہ دینے سے تمام مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ چشمہ کہنے کی ضرورت
باقی نہیں رہی البتہ حیوان کے ساتھ چشمہ نہ لکھنے سے پورے معنی ادا
نہیں ہوتے کیونکہ تنہا حیوان کا لفظ جاندار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

چشمۂ حیوان کے متعلق علمائے تحقیق کا مسلمہ بیان ہے کہ اس حوض
کے پانی کو ایک دفعہ پی لینے سے انسان ایسی زندگی حاصل کر لیتا ہے
جو کبھی فنا نہیں ہوتی۔ یعنی یہ پانی حیات جاوید عطا کر دیتا ہے یہی وجہ ہے
کہ اسے آب بقا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور یہ چشمہ ایک ایسے
مقام پر واقع ہے جہاں چاروں طرف گہری تاریکی مسلط ہے۔ اس لئے
اس چشمہ کو تلاش کرنا ممکن نہیں، جب تک کوئی اہل راز رہنمائی کر کے
اس کے کنارے تک نہ پہنچا دے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی دلچسپی سے
خالی نہ ہو گا کہ اسلامی روایات کے مطابق اس چشمہ کا علم حضرت خضر اور
الیاس علیہم السلام کے نفوس قدسی کے بغیر کسی کو میسر نہیں یہ دونوں بزرگ
اس چشمہ کا پانی پی چکے ہیں اس بنا پر انہیں غیر فانی زندگی حاصل ہے۔ وہ
ہر وقت زندہ ہیں اور ابدالآباد تک زندہ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے
ان کو بحر و بر کی حکومت سونپی گئی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام پانی پر قابض
ہیں اور حضرت الیاس علیہ السلام خشکی پر قابض ہیں۔ جب تک آپ میں سے کوئی
بزرگ چشمۂ حیوان تک جانے میں رہبری نہ کریں، اس وقت تک کوئی شخص
آب بقا کو نہ اندھیرے میں تلاش کر سکتا ہے اور نہ اس چشمہ کا پانی پینے میں کامیاب
ہو سکتا ہے کیونکہ وہ اندھیرا اتنا شدید اور گھنا ہے کہ کوئی آنکھ اس میں دیکھنے

کی طاقت نہیں رکھتی۔

شاعر کہتا ہے کہ یورپ میں علم و ہنر کی جو روشنی ہے، یہ چشمۂ حیواں کے گرد و پیش پھیلی ہوئی تاریکی کے مشابہ ہے۔ اس میں آب حیات کا چشمہ موجود نہیں یعنی وہ تاریکی تو اپنے اندر ایک عظیم الشان مقصد رکھتی ہے لیکن یہ تاریکی محض اندھیرا ہے جس میں نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہے اور نہ کوئی مدعا مستور، بلکہ انسان کو ظاہری و باطنی طور پر بھٹکانے اور گمراہ کرنے والی تاریکی ہے جو علم و ہنر کی روشنی کا لباس پہن کر یورپ میں پھیل گئی ہے۔

عقل و خرد اپنی اس افادی حیثیت سے عالم انسانیت کے لئے ایک بہت بڑی زحمت ہے کیونکہ اس کے ظاہر و باطن میں نمایاں تفاوت ہے۔ یہ دیکھنے میں تو ایک روشنی معلوم ہوتی ہے مگر اس کی واقفیت ایک گھنی تاریکی سے عبادت ہے اور جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا ہے، اس کا عمل اس پر دلالت نہیں کرتا۔ بظاہر اپنے آپ کو انسانی فلاح و نجات کے وسیلہ کے طور پر پیش کرتی ہے مگر درحقیقت گمراہی و محرومی کی علمبردار ہے ؎

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

علم و حکمت، تدبر اور حکومت، عقل انسانی کی پیدا کی ہوئی یہ تمام چیزیں زبان سے تو مساوات کی تعلیم دیتی ہیں، ان کا ظاہری سبق تو یہ ہے کہ تمام انسان درجہ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھ برابری رکھتے ہیں۔ ان کے ہر قسم کے حقوق مساوی ہیں اور کوئی شخص دوسروں پر کسی حالت، کسی بات اور کسی کام میں فوقیت نہیں رکھتا۔ نہ کوئی چھوٹا ہے اور نہ کوئی بڑا، نہ کوئی حاکم ہے اور نہ کوئی محکوم۔ سب انسان قانونِ مساوات کے ماتحت

ہیں، ایک کو دوسرے پر کوئی امتیازی رتبہ حاصل نہیں۔ لیکن اصلیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایک شخص بھی کسی دوسرے کی برابری کا دعوی نہیں کر سکتا، وہ یہ خواب بھی نہیں دیکھتا کہ مجھے فلاں انسان کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل ہے، کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا، کوئی نیچا ہے کوئی اونچا اور کوئی خادم ہے کوئی مخدوم۔ افسر ماتحت کا خون چوستا ہے تو حاکم محکوم کا گوشت نوچتا ہے، چھوٹا بڑے سے نالاں ہے تو نیچا اونچے سے گریاں ہے۔ حتیٰ کہ بھائی بھائی میں بھی تفوق و امتیاز کا ایک عام احساس موجزن ہے اور یہ کیفیت مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہر طرف جاری وساری ہے۔

صورت حال کی اس عملی تصویر نے، علم و حکمت اور تدبیر و حکومت کے اس دعوٰی باطل کی حقیقت کو تو پورے طور سے واضح کر دیا جس کا اعلان انہوں نے تعلیم مساوات کی شکل میں بڑی بلند آہنگی سے کیا تھا اس وضاحت سے ثابت ہو گیا کہ یہ تعلیم محض الفاظ تک محدود ہے، عملی دنیا میں اسکی کوئی حیثیت نہیں عقل کی یہی حیلہ سازیاں انسانیت کو راہ راست سے بھٹکانے کا موجب ہیں کہ جو کچھ وہ کہتی ہے، کرتی نہیں اور عشق کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ جو کہتا ہے اس سے زیادہ کر کے دکھاتا ہے ؎

یا عقل کی روباہی یا عشق ید اللّٰہی\
یا حیلۂ افرنگی، یا حملۂ ترکانہ !!!

اس شعر میں حیات انسانی کے دونوں مسلمہ عملی راستوں یعنی عقل اور عشق کا وزن کیا گیا ہے۔ عقل کا راستہ چالاکی درمکاری کا راستہ ہے اور

اسے حیلہ افرنگی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح فرنگی اقوام اپنے ہر کام میں حیلہ و فریب استعمال کرتی ہیں، اسی طرح عقل بھی اپنے عملی پروگراموں میں حیلہ و فریب سے کام لیتی ہے اور گو کسی نہ کسی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے مگر اس کا طریق کار چونکہ سچائی اور راستی پر مبنی نہیں ہوتا اس لئے اس کی راہ بھی خطرات و حوادث سے لبریز ہے اور جس مقصد کا حصول اس کے پیش نظر ہو وہ بھی ناپائدار اور خطروں کی آماجگاہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے قلب انسانی کا سکون و اطمینان ہمیشہ کے لئے برباد ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے برعکس **عشق** کا راستہ دست قدرت کی تائید سے روشن ہوتا ہے اور یہ ترکوں کے حملہ سے مشابہ ہے۔ جس طرح حملۂ ترکانہ کامیابیوں اور فتح مندیوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے رونما ہوتا ہے، اسی طرح عشق کی راہ بھی کامرانیوں کو ساتھ لئے سامنے آتی ہے جس طرح ترکوں کا حملہ حق و صداقت کی بنا پر وجود پذیر ہوتا ہے اسی طرح عشق کا ظہور بھی صداقتوں اور حقیقتوں کو آغوش میں لے کر عمل میں آتا ہے۔ گویا عقل اور عشق کے درمیان وہ فرق ہے جو حیلہ افرنگی اور حملۂ ترکانہ کے مابین ہے۔ عقل ایک حیلہ سازی اور فریب کاری کا نام ہے اور **عشق** حق و صداقت کے ایک مظہر کی تعریف۔

علم و فقر | عقل و خرد کی تحریکات اپنی گوناگون مساعی اور آسمان گیر سرگرمیوں سے جو کچھ حاصل کرتی ہیں وہ علم و حکمت اور خبر و دانش ہے اور **عشق** و محبت کے جنون و وحشت کو اپنی بے تابیوں اور مدہوشیوں سے جو نعمت میسر آتی ہے وہ **فقر** و غنا ہے۔ **عقل و عشق** کا حاصل ہونے کی وجہ سے علامہ اقبالؒ نے ان دونوں کے فرق

مدارج کی وضاحت کرنے کے لئے بھی اپنے فلسفیانہ معارف کی روشنی ڈالی ہے تاکہ مطالعہ کرنے والے اُن نتائج سے بھی واقف ہو جائیں جو علم و فقر کی کاوشوں سے پیدا ہوتے ہیں اور عقل و عشق کے امتیازی مباحث کا کوئی پہلو بھی تشنۂ صراحت نہ رہے۔ چنانچہ جن اشعار میں مسئلہ کے اس پہلو پر بحث کی گئی ہے، ذیل میں ان کی تشریح کی جاتی ہے:-

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

تخت و تاج اور سپاہ و رعایا کا حصول فقر کے معجزات میں سے ہے۔ وہ اپنی اعجازی قوتوں سے دنیا بھر کے مرتبے اور جاہ و شوکت عطا کر سکتا ہے اور سرداری و شہنشاہی جس کو چاہے بخش دینے پر مختار ہے۔ اس جہاں میں کوئی عظمت، کوئی منصب اور کوئی بڑائی ایسی نہیں جو فقر کی طاقت سے حاصل نہ کی جا سکے۔ اسی بنا پر فقر کے اس ہمہ گیر جوہر کو معجزات سے تعبیر کیا گیا ہے اور درحقیقت یہ معجزات بھی ہیں کہ ایک نادار و بینوا جسے نانِ شبینہ تک میسر نہیں اور دنیا کے کسی گوشہ میں پناہ نہیں پاتا، امن و اطمینان کا سانس جس کو کبھی نصیب نہیں ہوتا، وہ جب فقر و غنا کے سایہ داماں میں آتا ہے تو روئے زمین کے تاج و تخت اور شاہی و امیری اس کے قدموں پہ نچھاور ہوتی ہے اور وہ ایک لمحہ میں تمام عزتوں اور تمام دولتوں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ تو یہ فقر کے اعجازات ہی کا ثبوت ہے کیونکہ فقر وہ لاثانی و لازوال چیز ہے جو تمام امیروں اور سرداروں پہ حکمراں رہا ہے اور شاہوں کی شاہی کا درجہ رکھتی ہے۔ یعنی فقر میروں کا میر ہے۔ میر یعنی سردار۔ یہ وہ سردار ہے جو سرداروں

پر حاکم ہے گویا سردار اس کے ماتحت اور فرماں بردار ہیں۔ یہ ان پر سرداری کرتا ہے جو دنیا پر سرداری کرتے ہیں اور بادشاہوں پر حکمرانی کرنے والا شہنشاہ ہے۔ بادشاہ وہ ہے جو ملک و سلطنت پر قابض ہے اور اس ملک و سلطنت کے باشندے اس کی ماتحت رعایا ہیں۔ لیکن فقر وہ شہنشاہ ہے جو بادشاہوں پر قابض ہے بادشاہ اس کی ماتحت رعایا ہیں اور وہ انہی پر حکومت کرتا ہے۔ یعنی فقر کائناتِ عالم کی تمام سرداریوں، تمام شاہیوں اور تمام عظمتوں پر حکمرانی کرنے والی سب سے بڑی سرداری سب سے بڑی شاہی اور سب سے بڑی عظمت ہے جو ان سب پر قابض ہے اور کوئی بزرگی یا بڑائی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن علم اس درجہ کو کسی طرح نہیں پا سکتا کیونکہ۔

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

علم کا مقصد یہ ہے کہ وہ عقل و خرد کو جہالت و نادانی کی آلائشوں سے پاک کرتا ہے۔ عقل اپنی فطرت میں ایک معمولی احساس فہم کے سوا کوئی شعور نہیں رکھتی۔ وہ ایک سامنے پڑی ہوئی چیز کے متعلق یہ تو جانتی ہے کہ ایک چیز ہے مگر یہ نہیں جانتی کہ یہ کیا چیز ہے؛ تو گویا اس کی یہ طبعی حالت ایک پتھر کی مانند ہے جو مٹی اور کیچڑ سے لتھڑا ہوا پڑا ہو مگر علم اُسے اُٹھا کر جہل و نافہمی کے کیچڑ سے پاک کرتا ہے، اور اس میں ہر شے کی ماہیت، عملی استعمال اور اثر و نتیجہ کو جاننے اور سمجھنے کا شعور پیدا کر دیتا ہے۔ جس چیز کے متعلق عقل کو صرف ایک پڑی ہوئی چیز سے زیادہ کچھ واقفیت نہیں، علم اُسی چیز کے متعلق اُسے تمام معلومات سے

نہ صرف آگاہ کر دیتا ہے بلکہ اس سے مختلف شکلوں میں کام لینے اور اس کے مقصد کو پایۂ کمال تک پہنچانے کے تمام قاعدے بھی واضح کر دیتا ہے۔ جس طرح وہ پرزہ بٹی کسی کام نہیں آتا، اسی طرح تنہا عقل بھی اپنی ذات میں کوئی کام دینے کی قابلیت نہیں رکھتی۔ پھر جب اس پرزے کو صاف کر کے مشین میں فٹ کر دیا جاتا ہے تو وہ ایسی ایسی حیرت انگیز چیزیں بناتا ہے جن کا ذہن انسانی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ عقل بھی جب علم کے صیقل سے صاف ہو جاتی ہے تو تحیر خیز ایجادات و اختراعات سے دیکھنے والوں کو دنگ کر دیتی ہے اور قسم قسم کی صناعیوں اور جدت آفرینیوں میں حد کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ تو ثابت ہوا کہ عقل کو جہالت کی غلاظت اور نادانی کی آلائش سے پاک صاف کرنا علم کا کام ہے اور علم کا تعلق چونکہ اسی عمل تک محدود ہے اس واسطے اس کا مقصود یہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ علم وخود کو غلاظت و آلائش سے پاک کرتا ہے اور اس کے علاوہ وہ کوئی کام سرانجام نہیں دیتا۔ مگر فقر اس سے بہت ہی بلند فرائض کی تکمیل کرتا ہے اور وہ یہ کہ انسان کے قلب و نگاہ کو پاکیزہ بناتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی طاقت، کوئی شئے یہ کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ انسان کا دل اور نظر طبعی طور پر بے عملی اور ناکرداری کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے ہوتے ہیں اور عمل و فعل کی غلط کاری اور مہمل استعمال کی بے شعوری انہیں ایسے خراب و غلط راستہ پر ڈال دیتی ہے۔ جہاں ان کا وجود ناپاکی اور معصیت سے از سر تا پا ملوث اور قباحتوں سے اس قدر آلودہ ہو جاتا ہے کہ ان کی ہر حرکت، ہر اقدام اور ہر خیال برائی اور بداخلاقی سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ حالت قلب و نگاہ کی ناپاکی اور بدکرداری کی آئینہ دار ہوتی ہے لیکن

جب ان پر فقر و غنا کا پرتو پڑتا ہے تو ان کی طبع اس کے اثر سے مغلوب ہوتی ہے تو وہ از خود پاکی و عفت سے معمور ہو جاتے ہیں۔ ان کے اعمال و حرکات اور تخئیل و تدبیر کلی طور پر پاکیزگی کی امان میں آجاتے ہیں اور فقر انہیں اپنے روحانی قلعہ میں اس طرح محفوظ کر لیتا ہے کہ اخلاقی کمزوریاں وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ پس یہ بحث لامحالہ اس نتیجہ پر لے گئی کہ فقر کا مقصود انسان کے قلب و نگاہ کی ذہنی و نفسانی برائیوں کی آلائش سے حفاظت کرنا اور انہیں عفت و پاکیزگی کی طرف کھینچ لینا ہے۔ وہ خیالات کو بھی بدکرداری سے بچا کر نکوکاری پر لگاتا ہے اور نظروں کو بھی بدبینی سے روک کر نیک عملی کی طرف راغب کرتا ہے۔

مقاصد کے اعتبار سے علم اور فقر کے مابین ایک نمایاں تفاوت یہ ہے کہ علم، انسان کے لئے صرف مادیات کا وقوف مہیا کرتا ہے اور اس کی پرواز اس جہانِ فانی تک محدود ہے مگر فقر مادی شعور کے علاوہ روحانی اسرار و معارف سے بھی اُسے آگاہ کر دیتا ہے اور اس کی توفیق دونوں عالم کے مراتب تک حاوی ہے ؎

علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم!
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ

علم، فقہ و حکمت کا ماہر ہے، وہ ان علوم کے متعلق پوری پوری واقفیت رکھتا ہے۔ اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ فقہ کا دامن کہاں تک وسیع ہے اور اس میں کن کن چیزوں کو بحث و تحقیق کی روشنی میں لایا گیا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ حکمت کی وسعت اپنے اندر کیسے کیسے حیرت انگیز معلومات اور کیا کیا حدتیں رکھتی ہے کائنات ارضی گوبینی اور دنیوی دونوں

نظام جن اصول وقواعد کی بنا پہ تشکیل وا جزاء کے درجہ تک پہنچتے ہیں، علم ان اصول وقواعد کے بنیادی وارتقائی تمام مسائل سے آگاہ ہے۔ وہ یہ بتا سکتا ہے کہ خدا کی عبادت اس کی قبولیت کا ذریعہ ہے اور اس کی ادائیگی کے لئے فلاں فلاں طریقے معین ہیں، وہ یہ بھی بتا سکتا ہے کہ ہم مشرق والوں کے کانوں تک مغرب کے لوگوں کی آوازیں بغیر کسی برقی تار یا دوسرے تعلق کے ایک سیکنڈ کے اندر اندر پہنچائی جا سکتی ہیں مگر یہ جاننا اس کے امکان سے باہر ہے کہ حیات انسانی کو روحانی عروج تک لے جانے کے کیا ذرائع ہیں اور رازِ حقیقت کی نقاب کشائی کس طرح کی جا سکتی ہے؟ یہ آگاہی صرف فقر کو حاصل ہے کیونکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام اور موسیٰ کلیم اللہ کا درجہ رکھتا ہے یعنی فقر ان قوتوں کا حامل ہے، وہ معجزات اپنے اندر رکھتا ہے جو حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہم السلام رکھتے تھے۔

عیسیٰ علیہ السلام کو خداوند عالم کی طرف سے یہ معجزانہ قوت عطا ہوئی تھی کہ وہ مردہ انسانوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ اسی معجزہ کی بنا پہ آپ کو مسیحا کے نام سے موسوم کیا جانے لگا چنانچہ مشرقی زبانوں میں اب تک یہ لفظ اصطلاحی طور پہ مردے زندہ کرنے کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو یہ فوقیت حاصل ہوئی کہ آپ ذات ربانی سے ہمکلام ہوتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے آپ کو کلیم اللہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو شاعر کہتا ہے کہ فقر کو بھی وہی درجے حاصل ہیں جو ان پیغمبروں کو حاصل تھے۔ یعنی وہ مسیح علیہ السلام کی طرح مردہ روحوں کو زندگی کی حرارت بھی بخشتا ہے اور موسیٰ کلیم اللہ کی طرح خدا سے ہمکلام ہونے کا شرف بھی عطا کر دیتا ہے۔ فقر انسان کو وہ حیات ابدی دیتا ہے جس کے بغیر زندگی مردوں سے بھی

بدتر ہے اور فقر ہی تقرب الٰہی تک پہنچاتا ہے۔ علم کو یہ مقصد نصیب نہیں ہے کیونکہ وہ صرف راستے کو تلاش کرنے والا ہے، راستے کو جاننے والا فقر ہے۔ پھر جو خود راستہ کو ڈھونڈ رہا ہو، وہ کسی کو منزل مقصود تک کب لے جا سکتا ہے! منزل مقصود تک تو وہی پہنچا سکتا ہے جو راستے کا علم رکھتا ہو، اس کے پیچ و خم سے واقف اور ان میں پیش آنے والے واقعات و خطرات سے آگاہ ہو۔ چنانچہ علم اور فقر کا امتیاز وہی حیثیت رکھتا ہے جو منزل و رہرو کے فرق کو حاصل ہے۔

فقر مقام خبر، علم مقام نظر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ!

فقر خبر کا مقام ہے اور علم نظر کا مقام۔ یعنی فقر دنیا و آخرت کی ظاہری و باطنی تمام حقیقتوں سے خبردار ہے اور ان کے رموز و نکات کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔ جب کوئی شخص فقر کا مقام حاصل کر لیتا ہے تو اس کے دل پہ فانی و غیر فانی دونوں جہانوں کے راز منکشف ہو جاتے ہیں مگر علم صرف نظری علوم کی واقفیت بہم پہنچاتا ہے اور اس کی آگاہی ان اشیاء تک ہی محدود ہے جو انسانی آنکھ اپنے سامنے پھیلی ہوئی دیکھتی ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا اور نہ کچھ بتا سکتا ہے۔ علم چونکہ خود بھی فانی ہے اس لئے اس کی تحقیقات بھی انہی چیزوں تک پہنچتی ہے جو انسان کی فانی نظر کے مشاہدہ میں آتی ہے۔ یعنی علم فقط یہی استعداد رکھتا ہے کہ نظر آنے والی اشیاء کی بناوٹ، ان کی تنزلی و ارتقائی کیفیات اور افعال و نتائج کا تجزیہ کر سکے۔ اسی لئے علم کا مقام نظر تک موقوف ہے اور وہ فقر کی طرح ظاہر و باطن، مرئی و غیر مرئی اور مضمر و غیر تمام عالموں کی خبر

دینے سے قاصر ہے۔

فقر چونکہ قلب و روح سے تعلق رکھتا ہے اور غیر فانی قوتوں کا حامل ہے اس لئے اس کی دنیا میں مستی ایک ثواب کا درجہ رکھتی ہے اور علم میں نظر کا فانی مقام ہونے کی وجہ سے مستی گناہ کی حیثیت رکھتی ہے فقر و علم میں مستی کی حیثیتوں کا یہ بُعد المشرقین اس سبب سے ہے کہ دنیائے فقر میں مستی عشق و محبت کی ایک سرشار کیفیت اور ذوقِ جلوہ کی ایک محویت کا نام ہے کیونکہ یہاں اس کا ظہور کسی قسم کی نفسانی خواہشات یا عملی بداعتدالیوں کی بنا پر نہیں ہوتا، یہ جامِ ارغوانی یا رگِ گُل کنار کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ مے نظارہ کے سرور سے پیدا ہوتی ہے اور نہایت پاکیزہ کیفیت رکھتی ہے۔ اس لئے فقر میں اس مستی کو ثواب کا مقام حاصل ہے جس طرح کوئی اچھا کام کرنے سے انسان کو ثواب ملتا ہے اسی طرح فقر میں مستی کی کیفیت پیدا ہونے سے قرب و حضوری کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اہلِ فقر جب عالمِ مستی میں محو ہو جاتے ہیں تو گویا وہ جلوۂ ذات کے روبرو چلے جاتے ہیں اور دوسری دنیا سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قانونِ فقر ان پر کوئی احتساب نہیں کر سکتا بلکہ ان کی اس حالت کو ثواب کا درجہ قرار دیتا ہے۔

اس کے برعکس حدودِ فقر سے باہر نکل کر دائرہ علم میں جب کسی کو مست و مخمور دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کسی نشہ آور چیز سے اپنے آپ کو ہوش و خرد سے بیگانہ کیا ہوا ہے اور اس کی یہ مستی عملی بداعتدالی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس حالت میں علم کا فرض ہے کہ وہ اس بدکرداری پر گرفت کرے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دینی و دنیوی، مذہبی

ومعاشرتی نقطۂ نظر سے یہ خمار ایک بدمستی اور معصیت کاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ اس مستی پر گناہ کا جرم عائد کرتا ہے۔ مقام فقر کی مستی تو ایک عرفانی کیفیت اور ایک حقیقی سرور ہونے کی وجہ سے نیکی کا درجہ رکھتی ہے اور قانون تصوف اُسے کار ثواب کے نام سے یاد کرتا ہے مگر مقام علم کی مستی ایک اخلاق سوز بے ہوشی اور مجرمانہ عصیاں پرستی کی حیثیت رکھتی ہے جو اخلاقِ انسانی کے ضابطہ میں درحقیقت گناہ ہے۔

ایک سرمستی و حیرت ہے سراپا تاریک
ایک سرمستی و حیرت ہے تمام آگاہی

ایک سرمستی اور حیرانی سر سے پاؤں تک تاریکی اور گمراہی کا مرقع ہے۔ یہ انسان کے دل کو روشن نہیں کرتی بلکہ اندھیرے میں ڈال دیتی ہے۔ اور یہی وہ مستی و حیرت ہے جو علم و حکمت کی دنیا میں پیدا ہو جاتی ہے چونکہ اس کا کام انسانیت کو راہ راست سے بھٹکا کر دور لے جانا ہے اس لئے یہ گناہ ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ گناہ کا مقصود بھی یہی ہے کہ وہ نوع انسان کو منزل مقصود کے راستہ سے مختلف حیلوں اور بہانوں سے روکتا ہے اُسے اپنی دلآویز رنگینیوں اور سحر کار دلچسپیوں میں اُلجھا کر مدعا سے غافل کر دیتا ہے احساس حق تک دور لے جاتا ہے کہ انسان اپنی محرومی کا احساس کرنے کے بھی قابل نہیں رہتا۔ بالکل یہی حالت علم و دانش کی مستی کی ہے کہ وہ بھی اپنے خدمات کے غرور میں انسان کو راز حقیقت تک پہنچنے سے روک دیتی ہے اور اصلیت کے راستہ میں تاریکی کا ایک ایسا گھنا پردہ بن کر حائل ہو جاتی ہے جس میں کچھ دیکھ لینا دائرہ امکان سے باہر ہے۔ وہ اپنی آسمان گیر طاقتوں کے کمال پر راز کا ایسا اٹل یقین دلاتی ہے کہ انسان اسی کو اسرار

حقیقت تصور کرنے لگ جاتا ہے اور اس تاریک خیال میں ایسا کھو جاتا ہے کہ اُسے منزل کی تلاش ہی نہیں رہتی ۔یہی وجہ ہے کہ علم کی مستی کو گناہ کہا گیا ہے۔ مگر اس کے علاوہ ایک سرمستی وحیرت وہ ہے جو تمام کی تمام آگاہی اور راز داری کی تصویر ہے ۔اس سرمستی میں انسان ان تمام سربستہ وپوشیدہ رموز ومعارف سے واقف ہو جاتا ہے جسے دنیا کی کوئی دوسری قوت دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ اور یہی وہ سرمستی وحیرانی ہے جو عشق و فقر سے پیدا ہوتی ہے اور جو قرب وحضوری کی لذتوں سے آشنا کرتی ہے۔ یہ مستی سالک پہ ظاہر و باطن ، حقیقت ومعرفت اور دونوں جہانوں کے اسرار منکشف کر دیتی ہے اور چونکہ یہ کیفیت راہ حقیقت کی طرف جانے اور اسے پانے کا اصل ذریعہ ہے اس واسطے اس کی ہر حرکت ، ہر عمل نیکی اور ثواب کا درجہ رکھتی ہے ۔

فقر کی مستی ایک ایسی رفیع الشان عظمت ہے جس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی ۔چنانچہ علامہ مغفور اس پہ روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں ؎

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری

بزم عالم میں فقر اپنی بے شمار مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے ۔ ایک صورت وہ ہے جو شکاری کو تیر چلانے کا طریقہ سکھاتی ہے ۔ فقر چونکہ ایک مجسم آگاہی کا نام ہے اس لئے صیاد کو تیر اندازی سے آگاہ کرنا اسی کا کام ہے اور ایک صورت فقر کی وہ ہے جو جہانبانی وحکمرانی کے راز ذہن انسانی پہ فاش کرتی ہے ۔ وہ یہ بتاتی ہے کہ جہان کی فتح وتسلط کا حصول کن اسرار میں پوشیدہ ہے ۔یعنی اگر ہم ساری دنیا پہ قبضہ کر کے شہنشاہ بننے کی تمنا

رکھتے ہیں تو اس کا شعور بھی فقر ہی سے حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ یہی وہ زینہ ہے جس کے ذریعے سے ہم ذرہ سے آفتاب اور قطرہ سے سمندر تک کے اسرار و حقائق کو جاننے اور ہر مرتبہ و منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ پھر کہا ہے

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

ایک فقر سے قوموں میں عجز و ملال کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور وہ اس پر عمل پیرا ہو کر اپنا جاہ و جلال ضائع کر دیتی ہیں۔ فقر کی یہ صورت وہ ہے جو رازِ حقیقت کی آگاہی کی نہیں بلکہ ایک عام آگاہی کی مظہر ہے۔ اس میں وہ جوہر ہے جو قوموں میں مسکینی و دلگیری پیدا کرتا ہے یعنی یہ فقر عاجزی اور مسکینی کے جذبات کی تخلیق کرتا ہے اور ایک فقر وہ ہے جو مٹی میں کیمیا گری کی خاصیت پیدا کرتا ہے اس فقر کا امتیاز ہی یہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کو اعلیٰ ترین بنا دیتا ہے۔ یہاں فقر کی دو صورتوں پر بحث کی گئی ہے۔ ایک فقر انسانیت کی زوال و کمی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور دوسرا فقر عروج و ارتقا کے آخری مقام پر پہنچانے کا ضامن ہے اور یہی وہ فقر ہے جو نہ صرف رازِ حقیقت سے آگاہ کرتا ہے بلکہ حقیقت کی بلندیوں تک پہنچنے کا واحد ذریعہ یہی ہے۔

ایک فقر ہے شبیری اک فقر ہے میری
میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری

ایک شبیر یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کا فقر ہے جو رضائے الٰہی کے سامنے پورے عجز و نیاز کے ساتھ جھک جانے اور جلوۂ ذات کے

اشارہ پر اپنے جان و مال اور آل و اولاد تک کو اعلائے حکمۃ الحق کی راہ میں قربان کر دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کا منشا ہی یہ ہے کہ محبوب حقیقی کے عشق و محویت میں تسلیم و رضا کی وہ کیفیت پیدا ہو جو تحصیلِ مقصد کے لئے اپنی جائداد، عزیز و اقارب، جاہ و حشمت غرض اپنی ساری کائنات لٹا دینے کی تڑپ ایک لازوال احساس فخر کے طور پر پیدا کر دے۔ یہ فقر شبیری کا مقام ہے لیکن ایک فقر اس کے برعکس سرداری عطا کرتا ہے جو خود کسی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے دوسروں کو اپنے سامنے جھکانے کا سبق دیتا ہے۔ وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ کسی کے ماتحت رہ کر اس کی فرمانبرداری کرے۔ بلکہ خود فرمانروائی کرتا ہے اور دوسروں کو اپنے حکم کی تابعداری پر مجبور رکھتا ہے۔ سرداری کا اقتضا ہی حکمرانی اور مخدومی ہے چنانچہ یہ فقر سرداری و حکمرانی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ تسلیم و رضا اور عجز و نیاز کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔

فقر کی یہ مختلف صورتیں بیان کر کے آخری مصرعہ میں یہ فیصلہ صادر کر دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو فقر شبیری کے فیوض و برکات سے متمتع ہونا چاہئے کیونکہ یہ فقر حضرت امام حسینؑ کے غیر فانی سرمایہ سے مسلمانوں کو ورثہ کے طور پر حاصل ہوا ہے اس لئے اس میراث کے وہی مستحق ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ کسی دوسرے فقر کی بے حاصل جستجو کی بجائے فقر شبیری کے تحفظ و حفاظت پر اپنی تمام کوششیں مرکوز کر دیں کہ یہ فقر اُن کی ذاتی جائداد ہے جو انہیں اسلاف کرام سے ترکہ میں ملی ہے۔ اپنی جائداد و راثت کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف توجہ کرنا سب سے بڑی غفلت، خود فراموشی بلکہ جہالت و محرومی ہے۔ پھر وراثت بھی فقر شبیری ایسی بے مثال عظمت اور تابندہ جاوید دولت کی جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی بڑائی اور کوئی بزرگی نہیں کر سکتی فقر شبیری

کو صرف مسلمانوں کے لئے اس بنا پر مخصوص کر دیا گیا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی روحانی اولاد مسلمان ہی ہیں اور آپ نے اپنی حیات طیبہ میں جو سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑی پونجی حاصل کی وہ فقر کی نعمت اور عشق خداوندی کی والہانہ محویت کا سرمایہ ہے۔ تو اس حالت میں بچوں کو وہی چیز مل سکتی ہے جو ان کے باپ کے قبضہ میں ہو اور جو کچھ باپ کے قبضہ میں نہیں، وہ بچوں کو کہاں سے مل سکتا ہے؛ چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس فقر کی جائداد تھی جو آپ کے انتقال کے بعد مسلمانوں کو وراثتاً حاصل ہو گئی۔ ماشاء اللہ! مسلمانوں کے حصہ میں کتنی بڑی نعمت آئی ہے اور نعمت بھی ایسی غیر مترقبہ جو انہیں میراث بن کر مل گئی ہے۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ اس مقدس دولت کی حفاظت کریں۔

فقر کے یہ تمام روپ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا ظہور کون و مکان کی ہر پستی اور ہر بلندی پر کارفرما ہے اور اس کی ہستی ایسے ہزارہا معجزات سے معمور ہے جن کا ایک ادنیٰ کرشمہ ذرہ کو آفتاب بنانے کے لئے کافی ہے مگر علم و حکمت کو مبداء فیاض سے یہ توفیق ارزانی نہیں ہوئی۔ ذیل کے اشعار میں اس نظریہ کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ ارشاد ہے ؎

علم کا موجود اور فقر کا موجود اور
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

علم کا وجود اور فقر کا وجود دونوں الگ الگ راستے اور جدا جدا مقاصد و نتائج رکھتے ہیں۔ نہ ان کے عمل میں کوئی یکسانیت ہے اور نہ نتیجہ میں مماثلت۔ علم کی موجودگی اور معنی رکھتی ہے فقر کی موجودگی اور معنی رکھتی ہے علم جو کچھ حاصل کرتا ہے فقر کی دنیا میں حقیر و بے مایہ ہے اس لئے ان دونوں کے باوجود بالکل

علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں میں اس امر کی صدق دل سے کلمہ پڑھ کر شہادت دیتا ہوں۔ میں اپنے اس بیان پر خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ ان دونوں کے ظہور میں بہت بڑا فرق اور اختلاف ہے۔

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

فقر تو اس اعجاز کا مالک ہے کہ جب خودی کی تلوار کو اس کی سان پہ چڑھا کر تیز کیا جاتا ہے تو اس کی دھار میں ایسا بے پناہ جوہر پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف ایک سپاہی کی ضرب پورے لشکر کے برابر کام کرتی ہے۔ یعنی خود اعتمادی کا یقین سب سے مستحکم ہوتا ہے۔ یقین خود اعتمادی کے فقر سے مستحکم ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جب فقر قلب انسانی میں اپنی موجودگی کا یقین پیدا کرتا ہے اور انسان دائرہ فقر میں پہنچ کر اس کی معجزانہ قوتوں پر کلی اعتماد حاصل کر لیتا ہے تو اس کے اس یقین اور اس اعتماد میں یہ جوہر ہے کہ اگر وہ سپاہی کی صورت اختیار کر کے اپنی تلوار کا ایک وار کرے تو یہ ایک وار پوری فوج کے حملہ کے برابر اثر کرتا ہے۔

خودی اور خود اعتمادی کا عام تصور ایک تیغ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی مدد سے انسان ہر چیز پر فتح پا سکتا ہے اور پھر یہی تیغ اگر اس عام تصور سے آگے بڑھ کر فقر کی سان پہ چڑھ جائے تو اس کی دھار اتنی تیز، جوہر دار اور طاقتور ہو جاتی ہے کہ ایک سپاہی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اس تیغ کا ایک وار لشکر کے برابر نقصان کرتا ہے۔

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینہ مہر و ماہ!

اگر اس مُشتِ خاک میں ایک زندہ اور بیدار دل ہو تو اس کی نگاہ سورج اور چاند کے آئینے توڑ دینے کے لئے کافی ہے۔ دل میں زندگی اور بیداری عشق و فقر سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ جب انسان کے دل میں عشق فقر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں تو گویا اُس کی مردہ ہستی میں زندگی کی روح اور بیداری کی کیفیت از خود نمودار ہو جاتی ہے۔ عشق و فقر کے بغیر دل کی حیثیت ایک مردہ کی مانند ہے اور اس حالت کو زندگی کی عمارت میں بدلنے والی چیز دوسری کوئی نہیں۔ یہ معجزہ عشق و فقر ہی کو حاصل ہے کہ وہ دل کے مردہ قالب میں زندگی اور بیداری پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں شاعر کا مقصد دل کی اسی زندگی اور بیداری سے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر اس مٹی کے ڈھانچے یعنی انسان کے وجود میں ایک ایسا دل موجود ہو جس کو عشق و فقر نے زندہ و بیدار کر دیا ہے تو اس کی نگاہ میں وہ قوت اور وہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو سورج اور چاند کے شیشوں کو بھی پاش پاش کر دے۔ نظر کا کام یہ ہے کہ وہ زیادہ تیز روشنی کی طرف دیکھنے سے عاجز آ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آفتاب کی طرف دیکھنے کی کوشش کی جائے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں مگر علامہؒ فرماتے ہیں کہ زندہ و بیدار دل رکھنے والے انسان کی نگاہ میں یہ جوہر پیدا ہو جاتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ سورج کی طرف دیکھنے سے تھک جائے، سورج اور چاند اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتے اور اُن کی ہستی نظر پڑتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔

یہ ہے اُن معجزات فقر کا ایک منظر جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں بیان فرمایا ہے کہ عقل و عشق اور علم و فقر کے مقامات ایک دوسرے سے اتنے مختلف اور بعید ہیں جیسے کہ زمین اور

آسمان! اور یہ ایک بین حقیقت ہے کہ اگر انسان ذوقِ عشق سے محروم ہے تو خواہ وہ عقل و دانش کے کسی بھی رتبہ تک پہنچ جائے۔ ایک زندہ لاش سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ علم و حکمت کی انتہا تو محض مادی ارتقا تک محدود ہے۔

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

جو قوم آسمانی فیض سے محروم ہو، اس کے کمالات کی وسعت بجلی اور بخارات (بھاپ) کی شعبدہ کاریوں سے آگے نہیں جا سکتی۔ فیضانِ سماوی یعنی آسمانی فیض سے عشق و فقر مراد ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں اُس روحانی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں جس کا راز عالمِ سماوی سے وابستہ ہے اور عشق و فقر کی کیفیت بھی آسمان والوں سے مناسبت رکھتی ہے چنانچہ آسمانی فیض کا حصول انہی کو نصیب ہوتا ہے جو اہلِ عشق ہیں۔ عشق و فقر کے بغیر فیضانِ سماوی کے نزول کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اس بنا پہ علامہؒ فرماتے ہیں کہ جو قوم ذوقِ عشق سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے فیضِ آسمانی سے محروم ہو، وہ عقل و خرد کی غلام ہوتی ہے اور اس واسطے اُس کے کمالات کی پرواز صرف انہی اشیاء تک موقوف ہے جنہیں عقل کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے یعنی بجلی کے حیرت انگیز کارنامے اور بھاپ کی عجیب و غریب مشینوں کی حیرت آرائیاں۔ بس عقل و علم کی انتہائی ترقی یہ ہے جو انسانوں کو روحانی طور پہ مردہ کر دیتی ہے۔

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

مشینوں کے سہارے پھیلا ہوا نظام حکومت دل کی موت کا باعث ہے کیونکہ ہتھیار انسان کی دوستی اور رواداری کے احساس کو کچل دیتے ہیں۔ مشینی سلسلہ نظام کا ابتدائی مرحلہ یہ ہے کہ جب انسان اپنے کاروبار اور مقصد برآری کے لئے مشینوں سے کام لینا شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے دوسرے انسانوں کی ضرورت سے بے نیاز ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل میں اپنے بھائیوں کی قدر و قیمت کا احساس ہی باقی نہیں رہتا اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ تن تنہا مشینوں کی امداد سے دنیا بھر کے کام سرانجام دے سکتا ہے اس لئے کسی دوسرے انسان کی اعانت کوئی معنی نہیں رکھتی احساس مروت کو کچلنے کا یہ پہلا سبب ہے پھر اس کے بعد دوسرا مرحلہ وہ ہے جب ایک مشین ہزارہا انسانوں کو موت و ہلاکت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ اس وقت مشین کے منہ سے آگ اور بارود کے طوفان پیدا کرنے والا انسان اپنے دل کو نرمی، محبت اور رواداری کے جذبات سے بالکل خالی پاتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کی برسائی ہوئی آگ کے شعلوں سے جلنے والے بھی میرے بھائی ہیں، وہ ان کی تباہی اور بربادی کی ایک ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتا، ان کی زندگی اور انسانیت کو نظر میں بھی نہیں لاتا، اس کا دل اس وقت حیوان سے زیادہ سخت اور بے احساس اور انگارے کی طرح غضبناک ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا کہ مرنے والوں کی زندگی بھی اس کی اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے اور ان کی موت اپنی موت کی مانند اندوہناک۔ اگر یہی انسان تلوار سے مسلح ہوتا تو ایک نہ سہی دو دشمنوں کو مار لیتا اور بہت ہی بہادر ہوتا تو چار چھ آدمیوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتا۔ پھر اگر دشمن زیادہ تعداد میں حملہ آور ہوتے تو اپنی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے شاید جنگ کرنے سے باز

بھی رہتا اور اپنی دشمنوں کے ساتھ صلح و رواداری اور سلوک کرنے کی کوشش کرتا لیکن جب وہ مشین سے مسلح ہے تو اُسے صلح و امن کی طرف جھکنے اور اپنے دل میں نرمی اور دوستی کے جذبات پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اُسے معلوم ہے کہ وہ آن کی آن میں فوج در فوج انسانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے دل کو محبت و ملاطفت سے پھیر کر کے نہایت بے دردی اور سنگدلی کے ساتھ آگ کے طوفان اُٹھاتا ہے اور اپنے بے شمار بھائیوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ مشینی نظام حکومت انسان کے دل سے ہمدردی، مروت، دوستی، محبت اور سلوک و رواداری کا احساس زائل کر دیتا ہے اور جو دل محبت، مروت اور درد کے جذبات سے عاری ہے، وہ حقیقی زندگی سے محروم اور صحیح معنوں میں مردہ ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ مشینوں کی حکومت دل کے لئے موت ہے، وہ دل کو زندگی سے بے بہرہ کر دیتی ہے کیونکہ ہتھیار انسان کے دل سے مروت کا احساس زائل کر دیتے ہیں اور جس دل میں احساس مروت ہی موجود نہیں، وہ فی الحقیقت مردہ ہے۔

پھر اس کے علاوہ مشینی نظام کی تشکیل چونکہ عقل اور علمی نظریات کی بنیادوں پر ہوتی ہے اور عشق و محبت کی کیفیات کا اس میں کوئی دخل نہیں اس لئے یہ نظام دلوں کی موت کا باعث ہے۔ کیونکہ ہر چیز میں زندگی کی روح عشق سے پیدا ہوتی ہے اور جہاں عشق کی طاقت ہی کارفرما ہو، وہاں عقل خواہ کیسی ایجادات سے کام لے زندگی کا جوہر پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ دنیائے عقل کا ہر آفتاب لذتِ حیات سے ناآشنا اور دنیائے عشق کا ہر ذرہ روح زندگی سے لبریز ہے اور ہر

وہ چیز جو ظہور عشق کے بغیر پایۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ دراصل وہ خود بھی مردہ ہے اور اپنے متعلقین کو بھی مردہ بنا دیتی ہے مگر جو چیز تاثیر عشق سے عالم وجود میں آتی ہے وہ خود بھی زندہ ہے اور اپنے تعلقات کو بھی زندگی کی شعاعوں سے منور رکھتی ہے۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات

عقل نے اپنے علم و ہنر سے جو معجزے ظاہر کئے ہیں یعنی جو حیرت انگیز مشینیں اور ایجادیں پیدا کی ہیں اور تمدنی و معاشرتی ارتقا کے لیئے جو عجیب و غریب وسائل مہیا کئے ہیں یہ سب کے سب فنا ہونے والے اور اس جہاں کے نہ رہنے والے ہیں۔ ان میں ایک بھی چیز ایسی نہیں جو باقی رہ سکنے کی اہلیت رکھتی ہو یا زندگی دوام سے آشنا ہو۔ تمام فنا کے گھاٹ اُترنے والی ہیں کیونکہ ان کو بنانے والی قوت بھی فانی ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کام ناپائدار ہے۔ جہان کی بنیاد ہی بے ثباتی اور فنا پر ہے۔ اس لئے اس کا کوئی کام ثبات و دوام نہیں رکھتا۔ یہ دنیا قطعی بے ثبات ہے جسے کسی قسم کی پائداری حاصل نہیں۔ کیونکہ اس کی بنیاد عشق و فقر پر نہیں بلکہ عقل و علم پر ہے اور عشق و فقر کے بغیر ہر چیز ناپائدار اور بے ثبات ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

خونِ جگر کی اصطلاح عشق و محبت کی ایک کیفیت سے عبارت ہے اور اس کی مراد یہ ہے کہ محبت کے جذبات جب انسان کو اپنے بے پناہ حملوں سے مغلوب کر دیتے ہیں تو اس کا جگر شدتِ تاثیر سے خون

بن جاتا ہے۔ یہ سوزِ عشق کی انتہائی حالت ہے جس کا ذکر اردو اور فارسی زبانوں کی شاعری میں نہایت کثرت سے آتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں بھی اس اصطلاح کو دردِ محبت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ خونِ جگر یعنی دردِ عشق کی اس انتہائی کیفیت کے بغیر تمام انسانی نقش و نگار ناتمام اور غیر مکمل ہیں۔ جب تک خونِ جگر کی حالت پیدا نہ ہو، انسان اور اس کی کوئی چیز حدِ کمال تک نہیں پہنچتی، ادھوری اور نامکمل و ناتمام حالت میں رہتی ہے کیونکہ ہر چیز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا دردِ عشق کا کام ہے۔ حتیٰ کہ نغمہ جو موسیقی کی دلکش آوازوں کے باقاعدہ اجتماع سے بنتا ہے، اگر خونِ جگر کے اثر کے بغیر پیدا ہو تو ایک فضول دیوانگی اور بیہودہ وحشت کی حیثیت رکھتا ہے یعنی دردِ عشق کے بغیر گانا بھی ایک ناگہاں سودا کے برابر ہے حالانکہ اس کی فنی حیثیت بجائے خود مکمل ہوتی ہے۔ لیکن اگر اُسے دردِ عشق سے مجبور ہو کر گایا جائے تو وہ لطف و تاثیر کے لحاظ سے حدِ کمال تک پہنچتا ہے۔ عشق کے بغیر تو سجدہ بھی بے معنی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ؎

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اُس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود

اس شعر میں ایک بہت ہی بلند نکتہ بیان ہوا ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ پیکرِ نوری یعنی فرشتے کو اگر خدا کے حضور میں سجدہ کرنا میسر ہے تو پھر کیا ہوا! اُسے سجدوں میں وہ سوز و گداز تو نصیب ہی نہیں جو دردِ عشق سے پیدا ہوتا ہے اور جو پیکرِ خاکی یعنی انسان کے لئے وقف ہے۔ فرشتوں کو یہ فخر تو حاصل ہے کہ ہر وقت حضوری میں رہنے کی وجہ سے سجدوں

کی سعادت سے مستفیض ہوتے رہیں مگر ان کے یہ سجدے ذوق محبت کی محویت اور سوز گداز سے محروم ہیں کیونکہ وہ خلش عشق سے بے تاب ہو کر سجدہ نہیں کرتے بلکہ اطاعتِ الٰہی کا فرض سرانجام دینے کے لئے سر جھکاتے ہیں ۔ سوزِ عشق سے مجبور ہو کر سجدہ کرنا انسان کو میسر ہے کیونکہ اُس کے سجدوں کی بنیاد اسی نشاء پہ قائم ہے اور فرشتوں کے سجدوں کی بنا عبادت کے مقصد پہ رکھی گئی ہے ۔

اس تنقیح سے فرشتوں پہ انسانوں کا تفوق واضح کیا گیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ سوز و گداز کی کیفیت سے لبریز سجدے اُن سجدوں سے بدرجہا فائق ہیں جو صرف حقِ بندگی کو ادا کرنے کی غرض سے کئے جائیں اور انہیں فوقیت بھی اسی بنا پہ حاصل ہے کہ ان کا وجود ذوقِ عشق کی مجبوریوں سے ظاہر ہوتا ہے جس سے فرشتے قطعی محروم ہیں اور انسانوں میں بھی جو لوگ سوزِ عشق میں محو ہو کر خدا کے سامنے نہیں جھکتے، اُن کی عبادت قدرت کی اصل حقیقت تک نہیں پہنچتی اور نہ اُن کے لئے کسی فائدہ کا موجب ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ بے ذوق سجدہ ایک کھیل کی مانند ہے جیسے شاگرد اپنے استاد کے حکم پر انجام دیتا ہے مگر دل سے کھیلنا پسند نہیں کرتا ۔ اس کے برخلاف اگر وہ عشق و محبت کے سوز و گداز سے خدا کے روبرو سجدہ ریز ہو تو دونوں جہانوں کی برکت و سعادت، بزرگی و سربلندی اس کی بندۂ بے دام ہو جائیگی ۔

واقف ہو اگر لذتِ بیداریٔ شب سے
اُونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پُر اسرار

اگر انسان کی خاک، شب بیداری کی لذت سے آشنا ہو تو یہ پُر اسرار

مٹی ثریا سے بھی اونچا مرتبہ رکھتی ہے۔ شب بیداری اہل عشق کا شیوہ رہی ہے کیونکہ وہ اپنے محبوب کی یاد اور تصور میں دن کو بھی مشغول ہوتے ہیں اور رات کو بھی اسی کے ذکر و فکر میں بیدار رہتے ہیں بلکہ رات کا وقت ان کی توجہ کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کے لئے زیادہ موزوں اور قیمتی ہوتا ہے اس لئے وہ اُس ساکن اور خاموش عالم میں جب کہ کائنات کی زندگی گہری نیند میں مدہوش ہوتی ہے، وصال محبوب کے لئے اس کے تصور میں ڈوب کر صبح کر دیتے ہیں اور اس بیداری میں انہیں جو لذت نصیب ہوتی ہے، وہ دنیا کے کسی لطف و سرور، کسی عیش و مسرت اور کسی عمل و خیال میں نہیں ہوتی۔ شعر میں اسی لذت کی طرف اشارہ ہے جو عاشق کو رات بھر تصور محبوب میں کھو کر وصال تک پہنچنے سے حاصل ہوتی ہے کہ اگر انسان اُس لذت شب بیداری سے واقف ہو یعنی سوزِ عشق میں دن رات محو رہے تو اس کا درجہ ثریا یعنی ستاروں کے جھرمٹ سے بھی بہت زیادہ بلند ہے۔ اس مشت خاک کو بارگاہ ایزدی سے وہ شان عطا ہوئی ہے کہ اگر وہ عشق کے سوز گداز سے لذت آشنا رہے تو مہ و انجم سے بھی زیادہ رفعت کا مقام حاصل کر سکتی ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج سے مجھے یہ سبق حاصل ہوا ہے کہ بشریت کے عالم کی پرواز آسمانوں تک وسیع ہے اور افلاک کی لاانتہا بلندیاں اس کی زد میں ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے علمائے سائنس اور حکمائے تحقیق صدیوں تک انسان کو یہ

لگاکر فضاؤں میں اُڑانے گئے مسئلہ پہ غور کرتے رہے مگر اپنی موشگاف جد و جہد میں پھر بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی فکر رسا نے سبق و تجارات کے گھوڑوں پر سوار ہو کر اس معمہ کو حل کرنے کا راستہ تو بتایا مگر وہ بھی سطح ارضی سے چند فرسنگ کی بلندی سے زیادہ دور نہ جا سکا لیکن ع

عشق کی اک جست نے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

پیغمبر اسلام کے عشق تمام کی ایک ہی پرواز نے اس عقدۂ لاینحل کو سلجھا کر رکھ دیا۔ حضور کی ایک ہی جست نے عالم سماوی کی بے حد و کراں وسعتوں کو عبور کر لیا اور محبوبؐ خدا آن کی آن میں عرش عظیم پہ پہنچ گئے۔ آنحضرتؐ کی یہ پرواز اہل خرد کے لئے ایک عظیم الشان تازیانہ عبرت ہے اور جو لوگ کمالِ دانش پر انحصار رکھتے ہیں، ان کے لئے معراج کا واقعہ سرمۂ چشم بصیرت ہے اس لحاظ سے کہ عقل و حکمت اور علم و خبر کا کمال جس مقام تک اڑ کر پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ عشق حقیقی نے اُسے ایک لمحہ میں عبور کر لیا۔ تو ثابت ہوا کہ کائنات عالم میں عشق کی ایک ایسی طاقت بھی موجود ہے جو تحت الثریٰ سے لے کر سدرۃ المنتہیٰ کی ناقابل فہم وسعتوں تک پرواز رکھتی ہے اور جس کی زد میں کون و مکاں کی فراخی۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح معراج کے واقعہ نے خردمندوں کے لئے ایک عبرت آموز حقیقت روشن کر دی ہے، اسی طرح مجھے بھی اسی واقعہ سے یہ سبق ملا ہے کہ آسمان کی بلندیاں انسانی پرواز کی زد میں ہیں۔ اور اس کی شاہد وہ قرآنی صداقت ہے جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج کے نام سے منسوب ہے۔ اس اٹل برہان نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا

کہ اگر انسانِ خاکی فیض عشق سے بہرہ ور ہو تو زمینوں، فضاؤں اور آسمانوں کی وسعت و رفعت اس کی پرواز کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی !!!

عشق انسان کو اپنی حقیقت جاننے کے طریقے سکھاتا ہے اور اس کے فطری مقام و مرتبہ کو اس پر واضح کرتا ہے تو وہ ایک غلام ہونے کی حیثیت میں بھی حکمرانی و فرمانروائی کے بھیدوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ یعنی جذبہ عشق کو یہ توفیق حاصل ہے کہ جب اس کا ظہور انسان کو خود آگاہی کے آداب کی تعلیم دیتا ہے تو وہ غلاموں کو شاہی کے اسرار سے شناسا کر دیتا ہے اور ذرہ کو آفتاب بنا دیتا ہے۔ اس نکتہ نے جہاں ایک طرف یہ راز منکشف کیا ہے کہ انسان کو اس کی حقیقت سے خبردار کرنے والی چیز قوتِ عشق ہے اور یہی اسے اپنے آپ کو جاننے اور پہچاننے کے طریقے سکھاتی ہے ورنہ اس کے سوا دوسری کوئی شے اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتی، وہاں دوسری طرف اس واقعیت کو بھی اظہر من الشمس کر دیا ہے کہ عشق کی سکھائی ہوئی یہ خود آگاہی ایک غلام کو شہنشاہ بنا دیتی ہے اور وہ اپنی حقیقت سے واقف ہو کر سلطانی کے درجہ کو بھی حاصل کر لیتا ہے حالانکہ اس کے بغیر وہ ایک غلام رہتا ہے جس کا شہنشاہی کے مرتبہ تک پہنچنا عقل انسانی سے باہر ہے۔

دلائل و براہین کا یہ اگلا سلسلہ اس نظریہ کو پورے طور پر روشنی میں لاتا ہے کہ عشق کی لطافت اتنی بڑی طاقت ہے کہ عقل و خرد اور علم و دانش کا انتہائی کمال جس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا اور جس کی ایک نظر دنیا بھر کے دماغوں اور خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے ؎

ضمیر پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قارون نہ فکرِ افلاطون

انسان کو مقصودِ حقیقی تک پہنچانے والی یہ تین ہی چیزیں ہیں۔ قلب کی صفائی، نگاہ کی بلندی اور ذوقِ عشق کی مستی۔ ان تینوں کے بغیر کوئی طاقت انسان کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کی ہمت نہیں رکھتی نہ قارون کے مال و دولت کے خزانے اُسے حقیقت تک لے جا سکتے ہیں اور نہ یونانی حکیم افلاطون کی عقل و فکر کیونکہ مال و دولت اور فکر و دانش تو اس راستہ کی واقفیت ہی نہیں رکھتے جو مقامِ حقیقی تک پہنچتا ہے۔ اس راہ سے صرف عشق آگاہ ہے اور انسانی ضمیر میں پاکیزگی اور نگاہ میں بلندی بھی عشق ہی کے پرتو سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے صفائے قلب، بلند نگاہی اور عشق کی مستی کا مقابلہ قارون کی دولت اور افلاطون کی خردمندی نہیں کر سکتی کیونکہ وہ اس معمہ کو حل نہیں کر سکتی جسے عشق کا فیض بے تکلف حل کر دیتا ہے۔ چنانچہ رازِ حقیقت تک پہنچنے کے لئے عقل و خرد اور اس کی پیدا کی ہوئی دولت و حشمت بے حاصل و بے نتیجہ چیز ہے۔ کیونکہ

علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

عقل و دانش ضعفِ یقین کا علاج نہیں کر سکتی۔ انسان کا یقین اگر کمزور ہو تو اُس کو طاقتور بنانے کا ذریعہ خرد و حکمت کے پاس موجود نہیں ہے۔ فاضل اجل علامہ رازی کے گہرے حکیمانہ نکتے اگرچہ بڑے اوراد بر معنی ہیں مگر وہ ضعفِ یقینی کا علاج کرنے سے قاصر ہیں۔ یعنی کمالِ دانش کا علمبردار

رازی یوں تو بڑے بڑے دقیق مسائل کا تجزیہ اور بڑے بڑے گہرے نکات کی فلسفیانہ تصریح کرتا ہے، علم و حکمت کے نظریات پر عجیب و غریب بحث کرتا ہے اور اپنے علمی تجربے سے ایسی ایسی موشگافیاں کرتا ہے جو عقلِ انسانی کو متحیر کئے بغیر نہیں رہتیں لیکن یقین کی کمزوری کو دور کرنا اس کی بساط سے باہر ہے، وہ ضعفِ یقین کو یقین کی مضبوطی اور طاقتوری سے بدل دینے کا شعور نہیں رکھتا - کیونکہ اُسے وہ مقام ہی حاصل نہیں جہاں امراضِ یقین کی تشخیص اور تدارک کیا جا سکتا ہے - وہ یہ جانتا ہی نہیں کہ یقین کی کمزوری کے اسباب کیا ہیں اور اس کو صحت یاب کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے، حتیٰ کہ اُس کا علم و فضل ضعفِ یقین کی پہچان بھی نہیں رکھتا، پھر وہ علاج کیا کرسکیگا؟

ہرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے،
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

یہاں علامہ اقبالؒ زمانے کی زبان سے اسی نظریہ کی تصدیق کرتے ہیں - زمانہ اپنی رفتار کی پیچیدگی اور شام و سحر کے طویل سلسلہ کے علم و آگہی سے نوعِ انسان کی درماندگی کا اعلان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نجومی یعنی ستاروں اور آسمانوں کا علم رکھنے والے انسان کی آنکھ میرے پیچ و خم کو پہچانتی بھی نہیں ہے - وہ مہر و انجم کے سکون و گردش اور اس کے ذریعہ سے تقدیرِ انسانی کے اسرار کی تو واقف ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ فلاں ستارہ اس وقت فلاں برج میں ہے اور فلاں سیارہ فلاں مقام پر ہے - اس ستارے کی گردش دنیا پر یہ مصیبت لانے کا باعث ہے اور اس ستارے کا سکون وہ ابتلاء اہلِ زمین پر نازل کریگا لیکن

وہ زمانے کے خم و پیچ کو پہچاننے کی اہلیت نہیں رکھتی کیونکہ جس آنکھ کی نظر عرفان سے آشنا نہیں، معرفت کے رموز کو نہیں جانتی، اُس کا تیر نشانہ پہ نہیں پڑتا۔ یعنی جو آنکھ عارفانہ نظر نہیں رکھتی، اس کا تیر نشانہ سے بے خبر ہوتا ہے۔ نشانے پہ اُسی آنکھ کا تیر بیٹھتا ہے جس کی نظر عارفانہ اور اسرار معرفت سے آگاہ ہے۔ اسی طرح ضعف یقین کا علاج بھی وہی کہہ سکتا ہے جو مقام عشق سے محرم ہو کیونکہ یقین کی بیماریاں اسی عالم میں شفا پاتی ہیں ؂

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اے ضعف یقین کے مریض! تیرا علاج اس آگ کی سوزش میں ہے جو مولانا رومی کے سینہ میں روشن ہے اور تیرا یقین اس واسطے کمزور ہے کہ تیری عقل پر فرنگیوں کا جادو مسلط ہے۔ اس جادو کے اثر سے تجھ کو آتشِ رومی کا سوز ہی بچا سکتا ہے اور کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ مولانا رومی ایک عارف کامل تھے اور آپ کے دل میں سوز و گداز پیدا کرنے والی چیز عشق کی آگ تھی۔ آپ ہر وقت عشق حقیقی میں مخمور رہتے اور اسی کی کیفیت آپ پر ہمیشہ طاری رہتی۔ چونکہ ضعف یقین کا علاج عقل و خرد میں نہیں بلکہ عشق و فقر کے سوز میں ہے اس لئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اے انسان جدید! تیری عقل پر فرنگی اقوام کا افسوں غالب ہو گیا ہے اور تو اُن کے علمی عجائبات سے مسحور ہو چکا ہے جس کے باعث تیرے یقین میں کمزوری پیدا ہو گئی ہے اور یقین کی اس کمزوری کا علاج نہ علامہ رازی کے گہرے نکات میں مل سکتا ہے اور نہ حکیم افلاطون کی حکمت میں کیونکہ عقل و حکمت، تو اس بیماری کو پہچاننے

کی بھی قابلیت نہیں رکھتی۔ اگر تو ضعفِ یقین کا علاج کرنا چاہتا ہے تو اس کو مولانا رومی رحمۃ کے سوز و گداز میں تلاش کر جو عشق کی آگ نے ان کے قلب میں پیدا کیا ہوا ہے کیونکہ یقین کی کمزوری سوزِ عشق ہی سے رفع ہو سکتی ہے۔

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود!

ہست و بود کا راز یعنی خالق موجودات کے ہونے اور نہ ہونے کا بھید اس کی عجیب و غریب صنعتوں میں ملتا ہے جن کا ایک ادنیٰ کرشمہ برگِ گل کی رنگینی و رعنائی کی شکل میں ظاہر ہے یعنی قادرِ مطلق کی ہستی حسن و جمال کی دلآویزیوں میں جلوہ گر ہے۔ علم کے حیرت کدے میں اس کی کوئی نمود نہیں علم اور بیچارہ خود تعجب و تحیر کا مقام ہے، اس میں خدا کی ہستی کہیں دکھائی نہیں دے سکتی کیونکہ علم اس راز سے واقف ہی نہیں، وہ یہ جانتا ہی نہیں اور نہ جاننے کی قابلیت رکھتا ہے کہ اس سلسلہ کائنات کو پیدا کرنے والی بھی کوئی قوت ہے۔ یہ راز پھول کی پتی کے بوقلموں نقش و نگار سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کہ اس ایک معمولی اور چھوٹی سی پتی کو اگر انسانی عقل بنانے کی کوشش کرے تو ویسی چند لکیریں کھینچنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے، پھر وہ خوبصورتی اور نرمی وہ صفائی اور زیبائی ممکن نہیں کہ کسی چیز میں پیدا ہو جائے مگر خلاق فطرت نے ان حسین و جمیل پتیوں کا لاتعداد سلسلہ صفحۂ عالم پر پھیلا کر اپنی ہست و بود کا راز اہل نظر پر منکشف کر دیا ہے اس نے یہ بتا دیا کہ کوئی طاقت ایسی بھی موجود ہے جو اس کارخانہ حیات کو چلا رہی ہے اور جو کسی گوشہ میں بیٹھ کر اپنی کلکِ قدرت سے رخسارِ گل پر قسم قسم کے رنگین نقش و نگار بنانے میں مصروف رہتی ہے چنانچہ اس مظاہرِ فطرت کی موجودگی کا علم انہی دلکش تصویروں سے حاصل ہو

سکتا ہے، علم و دانش کا حیرت خانہ اپنے اندر اس کی کوئی نمود نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کی اپنی حقیقت ایک بے حاصل شے کی مانند ہے۔ ہستیٔ خداوندی کا راز حسن و جمال کی دل آرائی اور عشق و محبت کے سوز و گداز میں مضمر ہے اور ان چیزوں کا اسرار عقل و خرد کے دائرہ امکان سے خارج ہے ؎

حد ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی
سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری

عشق و مستی کی باتیں فہم و ادراک کے حدود سے باہر ہیں یعنی فہم و ادراک (عقل و خرد) عقیدت و مستی کی باتوں کو بالکل نہیں جانتے، انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ عشق و مستی کی رمزوں میں کیا کیا معنی اور کیسی کیسی حقیقتیں پوشیدہ ہیں؟ کیونکہ اس کا تعلق صرف مادی دنیا تک ہے، روحانی عالم کی نسبت وہ کچھ نہیں جانتی اور نہ کچھ بتا سکتی ہے مگر عشق و محبت کے اسرار مادیات سے قطعی طور پر جداگانہ اور بلند ترین مقام رکھتے ہیں اس لئے وہ عقل و خرد کے تنگ دائرہ میں سما ہی نہیں سکتے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ عشق و مستی کی باتیں حد ادراک سے باہر ہیں اور اس سلسلہ میں صرف یہی سمجھ میں آسکا ہے کہ عشق و مستی سے بُعد بیگانگی دل کی موت کا ثبوت ہے۔ جس دل میں کیفیت عشق کا ظہور نہیں، وہ حقیقت میں مردہ ہے، زندگی کی نعمت سے محروم ہے کیونکہ دل کی زندگی سوز عشق کی کارفرمائی سے عبارت ہے جو چیز عشق و مستی کے اثر سے بیگانہ ہے، وہ زندگی کی حرارت سے بھی بے بہرہ ہے اس لئے کہ کائنات کی زندگی کا راز جذبۂ عشق ہی کے وجود پر موقوف ہے۔ کوئی چیز جس قدر اثر عشق سے دور ہے، اسی قدر زندگی سے

بعید ہے۔ عقل و دانش کا انتہائی درجۂ کمال تک پہنچ جانا اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ عشق و مستی کا وجود بھی اس کے امکان میں ہے۔ عشق و مستی کی دنیا خرد و دانش سے بالکل الگ حقیقت ہے اور خرد اس کے رازِ دربار تک پہنچنے سے بھی عاجز ہے حتیٰ کہ اس کا تصور بھی عالمِ عشق کو نظر میں نہیں لا سکتا۔ کیونکہ وہ بذاتِ خود ایک حیرانی اور تاریکی ہے جو زمانہ کے لئے مستقل خطرہ کی صورت اختیار کر چکی ہے ؎

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

وہ گستاخ عقل جس نے فطرت کی پوشیدہ طاقتوں کو بے نقاب کیا ہے، جس نے ہواؤں اور پانیوں میں چھپے ہوئے برق و بخارات کو زندگی کی طرح متحرک کر دیا ہے اور جمادات و نباتات میں پوشیدہ مادی و کیمیادی طاقتوں کو منظرِ عام پر لا کھڑا کیا ہے، جس نے پہاڑوں کے سینے چیر کر لوہا، پیتل، تانبا اور دیگر دھاتیں نکالیں اور انہیں آسمانوں اور فضاؤں میں دوڑا دیا ہے، اسی بے ادب دانش کی اپنی بنائی ہوئی بجلیاں فطرت کے آشیانہ یعنی اس جہانِ ناپیدا کنار کو جلانے کے لئے بے تاب ہو رہی ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ اپنی جدید معلومات کے آتشیں حملوں سے دنیا کو پھونک ڈالیں۔ کیا موجودہ جنگ کی ہمہ گیر آگ نے کئی ملکوں اور ان میں بسنے والے بے شمار انسانوں کو خاکِ سیاہ کے تودوں میں تبدیل نہیں کر دیا، کیا سینکڑوں اور ہزاروں آبادیاں ویرانوں میں نہیں بدل گئیں؟ اور پھر جہاں سوزی اور بربادی کا یہ درد انگیز سلسلہ ابھی معلوم نہیں کہاں کہاں زندگی کے انجام پر تمام کرے گا؟

غور کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی کہ یہ تمام ویرانی

اور تباہی عقل و خرد ہی کے پیدا کئے ہوئے کمال کا نتیجہ ہے کیونکہ یہی وہ گستاخ قوت ہے جس نے فطرت کی پوشیدہ طاقتوں کو نوع انسان کے روبرو بے پردہ کیا اور اب اسی کے ایجاد کئے ہوئے برقی آلات سے فطرت کی جائے پناہ خطرہ میں پڑی ہوئی ہے اور یہ خطرہ بے معنی نہیں بلکہ حقیقت حالی پر مبنی ہے۔ آشیان فطرت کے اکثر تنکے جل کر راکھ ہو چکے ہیں اور باقی بھی اس خوفناک آگ کی زد میں ہیں جس کے شعلے مغرب سے مشرق اور شمال سے جنوب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ہے کمال خرد کی انتہا کہ جس نے خود ہی قوائے فطرت کا انکشاف کیا اور اب خود ہی اس کے لئے مصیبت اور تباہی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ عقل و خرد اور علم و حکمت کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ ہر چیز سے کام لینے کے بعد اُسے موت و ہلاکت اور فنا کی طرف لے جاتی ہے مگر عشق کا یہ دستور نہیں، وہ ہر چیز کو حیات، دوام اور بقا کی طرف لے جاتا ہے اور اپنے ملنے والوں کی دونوں جہاں کی زندگی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

حضرت ابراہیم خلیل اللہ پر جب اپنی عزیز ترین متاعِ حیات یعنی بیٹے کی قربانی کا خدائی امتحان نازل ہوا تو آپ نے بصد خوشی قبول کر لیا اور اس امتحان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنے فرزندِ جیّد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو تمام واقعہ سنا کر دریافت کیا کہ خداوندِ عالم نے مجھ سے تمہاری قربانی کا مطالبہ کیا ہے۔ کیا تم پسند کرتے ہو کہ تمہیں اللہ کی راہ میں ذبح کر کے پس اپنے وعدہ کو پورا کر دوں؟ اسمٰعیل علیہ السلام یہ سن کر بے حد خوش ہوئے

اور جواب دیا کہ اگر خدا تعالیٰ نے مجھے اپنے راستہ پر قربان ہونے کا فخر عطا کیا ہے تو براہ کرم جلدی کیجئے! ایسا نہ ہو کہ میں کسی وجہ سے اُس سعادت ابدی کو حاصل کرنے سے محروم ہو جاؤں جو مجھے راہ حق کی جانثاری اور آپ کی فرمانبرداری سے حاصل ہونے والی ہے۔

ماشاء اللہ! یہ ہے اُن بزرگان اسلام کا ایمان و استقامت جو عشق حقیقی کی کیفیتوں سے سرشار تھے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام کو فرزندی کے یہ آداب کہاں سے حاصل ہوئے، انہیں یہ سلیقہ کس نے سکھایا کہ باپ کے حکم پر جان کو قربان کر دینا بھی فخر و سعادت کا باعث ہے؟ یہ نگہ عشق کا فیض تھا یا تعلیم مدرسہ کی کرامت تھی یعنی انہیں کتابوں سے حاصل کئے ہوئے علم نے یہ ادب سکھایا یا فیض عشق کی نظر نے تسلیم و رضا کا یہ درجہ عطا کیا؟

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو یہ آداب فرزندی فیضان عشق ہی کی نظر سے حاصل ہوئے ورنہ آپ علم و دانش سے اس بات کا فیصلہ طلب کرتے تو وہ انہیں جانسپاری کی اذیت سے خوفزدہ کر کے انکار کی طرف متوجہ کر دیتی اور اس سوال کا جواب دینے کے لئے آپ کو گہری سوچ میں ڈال دیتا اور آپ کی آنکھوں کے سامنے اُس دردناک منظر کی تصویریں کھینچ کر پس و پیش کرنے پر آمادہ کر دیتا جب کہ روح انسانی قفس عنصری سے جدا ہوتی ہے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ فرمانِ پدر کو سنتے ہی سر نیاز خم کر دیا اور جس طرح باپ کو فیض عشق کی محویت نے بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنے کی دعوت دی تھی اسی طرح بیٹے کو عشق حقیقی کے سرور نے چھری کے نیچے گلا رکھ دینے پر بے تکلف رضامند کر دیا۔ یہ مکتب کی کرامت نہ تھی اور نہ علم

یہ سبق دینے کی قابلیت رکھتا ہے۔ چنانچہ علم کی اسی بے بسی کو ان الفاظ میں تصدیق کیا گیا ہے۔

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب

ذوقِ عشق کو مخاطب کرتے ہوئے شاعر اپنی گذشتہ محرومیوں کو کس حسرت آمیز لہجہ میں بیان کرتا ہے وہ کہتا ہے، اے ذوقِ عشق میرے ماضی کی ایک ایک شام و سحر تیرے سامنے ہے اور تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں غلط فہمی کی بنا پر علم کے فریب میں پھنسا رہا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ علم و فضل کے حصول سے کمالِ انسانیت تک پہنچ جاؤں گا اور یہ چیزیں منزلِ مقصود تک لے جانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ علم وہ درخت ہے جس میں رسائی موجود نہیں اور محض ایک خشک لکڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر کار تجربہ نے مجھ پہ یہ ثابت کیا کہ میری حصولِ علم کی تمام محنت رائگاں گئی کیونکہ رازِ حقیقت کے جس بلند مقصد کی خاطر میں نے اس کی رہنمائی کا دامن پکڑا تھا۔ اس کے متعلق اسے خود بھی کوئی خبر نہیں اور میرا یہ خیال غلط نکلا کہ علم سے مجھے سب کچھ مل جائیگا۔

اے ذوقِ عشق تجھ پہ یہ واقعہ پورے طور سے آشکارا ہے کہ میں دیدہ دانستہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا بلکہ اپنے اندازہ کی نادرستی کی بنا پہ ایسا ہوا ہے۔ اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا تو میں کبھی دھوکا نہ کھاتا اور یہ میری اسی نادانی کی سزا ہے کہ مجھے بڑی مدت تک اس بے حاصل درخت کے پیچھے بھٹکنے کے بعد بے نیل و مرام لوٹنا پڑا۔ چنانچہ اب میں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ علم اور عقل انسان کو منزل سے بھٹکانے والی چیزیں ہیں اور

اُسے جادہ مقصود سے بھلا دیتی ہیں مگر انسان کو گوہر مقصود تک پہنچانے کا اصل ذریعہ عشق ہے اور یہی اس کو کمال انسانیت سے ہمکنار کرتا ہے۔

تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا،
عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب

علم کی بے حاصلی کو تجربہ کی کسوٹی پہ پرکھنے کے بعد میرے دل میں اُس پرانے معرکہ کی یاد تازہ ہوگئی جو پیغمبر السلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور منکر اعظم ابولہب کے درمیان پیش آیا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلان توحید کا ارشاد ہوا تو آپ نے قبائل عرب کے سرکردہ لوگوں کو بلا کر انہیں توحید و رسالت پہ ایمان لانے کی دعوت دی۔ ان لوگوں میں حضور کا سوتیلا چچا ابولہب بھی موجود تھا، اس نے یہ سن کر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اے محمدؐ! کیا تم نے اسی غرض سے ہم کو بلایا ہے کہ ہم اپنے دین کو چھوڑ دیں؟ اس کے بعد ابولہب اپنی زندگی کے آخری سانس تک منکر ہی رہا۔ تو اس مثال سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ حضور نبی کریمؐ اپنے عشق و محویت کی بناء پہ ہمیشہ ابولہب کو ہدایت کی طرف بلاتے رہے مگر وہ اپنی عقل و دانش کے مطابق ہر وقت انکار کرتا رہا۔ حضورؐ کی دعوت عشق تمام کا نتیجہ تھی اور ابولہب کا انکار عقل تمام کی خود پسندی کا ثبوت۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ علم کی حقیقت سے آگاہی پاکر میرے ضمیر میں یہ واقعہ تازہ ہوگیا کہ عشق تمام کا مظہر تو محمد مصطفیٰ کی ذات بابرکات تھی جس نے بار بار ابولہب کو اپنے محبوب کی وحدانیت پہ ایمان لانے کی طرف متوجہ کیا اور عقل تمام کی تصویر، ابولہب تھا جو اپنی دانائی اور خردمندی کے غرور میں

بڑائی کے زعم میں اپنے بھتیجے کے پیغام حق کو تسلیم کرنے پر ہی آمادہ نہ ہوا اور قدم قدم پر انکار کرتا رہا عقل و عشق کے مراتب کا یہ ایک نمایاں امتیاز ہے کہ عقل تو جب تک کسی بات کو ماننے یا نہ ماننے کے متعلق کافی غور و خوض کے بعد فتویٰ نہیں دیتی، عقل کا بندہ اُس کو تسلیم کرنے پر رضامند ہی نہیں ہوتا لیکن عشق کی طاقت عشاق کو بہر حال محبوب کے دروازوں تک لے جاتی ہے۔

گاہ بحیلہ می برد گاہ بزور می کشد
عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب

کبھی حیلہ و بہانہ سے لے جاتا ہے اور کبھی زور سے کھینچ لیتا ہے۔ عشق کی ابتدا بھی عجیب ہے اور انتہا بھی عجیب ہے۔ ابتدا میں عشق کسی کو اپنی طرف لانے کے لئے حسن و جمال اور رعنائی و دلکشی وغیرہ کا بہانہ بناتا ہے اور طبع انسانی کو اپنی کیفیت سے روشناس کرانے کے لئے کوئی نہ کوئی وسیلہ کوئی نہ کوئی ذریعہ ضرور پیش کرتا ہے مگر جب عشق کا سوز انتہا تک پہنچ جاتا ہے تو وہ پورے زور سے عاشق کو کھینچ لیتا ہے۔ اس لحاظ سے عشق کی ابتدا بھی عجیب ہے اور عشق کی انتہا بھی تعجب انگیز ہے کبھی اُسے اپنا مطلب پورا کرنے کے لئے حیلہ و فریب سے کام لینا پڑتا ہے اور کبھی وہ ہر قسم کے حیلوں اور بہانوں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنی قوت اور جبر سے مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ اس نکتہ کو پورے طور پر ذہن نشین کرنے کے لئے یہ صراحت غیر ضروری نہیں کہ سب سے پہلے انسان کے دل میں عشق و محبت کے جذبات اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب انسانی حسن و جمال یا کسی اور خوش نما چیز کی کوئی

ادا اُسے لبھاتی ہے۔ اس ادا یا اس رعنائی کو دیکھ کر وہ اپنے اندر بار بار دیکھنے پیار کرنے اور اُس شے کے قریب تر ہونے کی خواہش کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ اس چیز کو حاصل کر لے یا اگر یہ محال ہو تو اس کے نظارہ سے اپنی آرزو کو تسکین دینے کا سامان پیدا کرے۔ کیونکہ اس کے قلب و نظر میں ہر وقت اسی چیز کی تمنا موجزن رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ یہ عشق کی ابتداء ہے جو اپنی کشش پیدا کرنے کے لئے حسن و خوبی اور دلکشی و رعنائی کے حیلہ کی محتاج ہے لیکن پھر جب عشق اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو وہ انسان کے دل و دماغ، قلب و نظر، جسم و روح غرض انسان کے ہر رگ و ریشہ میں سما جاتا ہے اور یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ اُسکی وہ مطلوبہ چیز جسے عشق نے بہانہ کے طور پر پیش کیا تھا، سامنے ہو یا اوجھل، دور ہو نزدیک، وہ جذبات عشق سے اس درجہ مسحور رہتا ہے کہ بے اختیار اُس کے تصور میں ڈوب جاتا ہے۔ اس مقام پر عشق اُسے جبراً اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

اس شعر میں کتنی پاکیزہ تشبیہ سے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ عشق انسان کے ریشے میں سما جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ جذبہ حقیقی انسان کی رگ رگ میں اس طرح سرایت کرتا ہے جس طرح پھولوں کی شاخ میں صبح کی ہوا کی نمی سما جاتی ہے۔ آپ نے بارہا مشاہدہ کیا ہو گا کہ جب چمن زاروں میں بادِ صبا کے سرور انگیز جھونکوں کا خرام نازغنچوں کے سکوت کو لطیف قہقہوں سے تبدیل کرنے میں مصروف ہوتا ہے تو اس کی ہلکی ہلکی رطوبت پھولوں

کی ٹہنیوں اور شاخوں پر پھیل کر اُن کے اندر جذب ہو جاتی ہے جس سے ٹہنیوں کے ریشہ ریشہ میں ایک نمی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ عشق بھی اسی نمی کی طرح انسان کے ریشہ ریشہ میں جذب ہو جاتا ہے اور اس کے جسم و روح کا کوئی حصہ کوئی ذرہ اور کوئی روم عشق کے اثر سے خالی نہیں رہتا یہی وہ حالت ہے جو کمال انسانیت کے حقیقی مظہر کی آئینہ دار ہے۔

مدارجِ عقل و عشق میں نمایاں تفاوت کا ایک رفیع الشان مقام ملاحظہ ہو ؎

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

خودی اگر علم سے محکم ہو تو جبریلؑ کے لئے قابل رشک ہے اور اگر خودی عشق سے محکم ہو تو صورِ اسرافیل کا درجہ رکھتی ہے۔

خودی سے یہاں وہ جذبہ مراد نہیں جسے عرف عام اور تصوفانہ اصطلاح میں کبر و غرور کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور جس کی موجودگی انسانی زندگی کے لئے ضرر رساں اور باعث ننگ تصور ہوتی ہے۔ بلکہ خودداری و خود اعتمادی کا وہ بلند احساس مقصود ہے جو کمال انسانیت کی سب سے بڑی شرط ہے۔ کلام اقبال میں اپنے اندر خودی کو پیدا کرنے اور احساس خودی کو بلند کرنے کی جو بار بار تلقین کی گئی ہے، اس سے یہی معنی اخذ کئے گئے ہیں کہ اپنے اندر وہ جذبہ یقین پیدا کرو جو ایک مسلمان کی امتیازی شان ہے اور جس کی موجودگی میں ایک نظر تقدیریں بدلنے کے لئے کافی ہے۔ قرآن حکیم نے بھی مسلمانوں کو جا بجا یہی ہدایت فرمائی ہے کہ تمہیں ساری کائنات پر افضل بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دنیا کی تمام اشیا تمہارے قبضہ قدرت میں ہیں اور ان سے کام لینا، ان کو مسخر کرنا تمہارا فرض ہے۔ تم اتنے بلند ہو کہ اگر شعور

پیدا کرو تو ہر شے پر تسلط حاصل کر سکتے ہو، زمین اور آسمان، چاند اور ستارے اور دنیا و ما فیہا یہ سب تمہارے زیر نگین ہیں۔ پس خودی کا مطلب اس حقیقت ثابتہ پر ایک مضبوط ایمان اور ایک اٹل اعتقاد رکھنا ہے۔ ایک مسلمان، ایک مرد مومن کو اپنے دل میں یہ پختہ یقین رکھنا چاہیئے کہ کائنات کی تمام اشیا اس کے پنجۂ اقتدار میں ہیں اور وہ ان سب پر غالب ہے۔ بشرطیکہ اپنے اندر وہ جوہر کمال پیدا کرے جو انسان کی بزرگی و سربلندی کا اصل باعث ہے۔

اس شعر میں اسی خود اعتمادی کے یقین کو مضبوط بنانے کے اسباب اور ان کے امتیاز کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ شعر پر غور کرنے سے ذہن انسانی پر سب سے پہلے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خودی کو دو ذرائع سے مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ذریعہ علم اور دوسرا عشق۔ پھر ان دونوں وسائل کے استحکام اور اس کے نتائج میں یہ فرق ہے کہ اگر احساس خودی اور یقین خود اعتمادی کو علم و آگاہی سے مضبوط بنایا جائے، خبر و دانش سے منظم کیا جائے تو اس کو وہ مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے جس پر جبریل بھی غیرت کھائے بغیر نہ رہ سکے۔ یعنی اس کا سینہ علوم و معارف کا ایسا خزانہ بن جاتا ہے کہ دنیا و عقبیٰ کے ظاہر اور باطن کے اسرار و رموز کو کما حقہٗ جاننے والا خدا کا مقرب فرشتہ بھی رشک کھانے لگے۔ مطلب یہ کہ علم انسانی کا مرتبہ جبریل امین علیہ السلام سے بھی زیادہ بلند ہو جائے۔ یہ خودی کو علم سے محکم کرنے کا نتیجہ ہے۔

لیکن اگر اسی احساس خود اعتمادی کو قوت عشق سے مستحکم کیا جائے تو اسے وہ درجہ مل جاتا ہے جو صور اسرافیل یعنی اسرافیل کی نفیری کو حاصل ہے۔ اسلامی اعتقادات کی روشنی میں صور اسرافیل کی روایت مسلمہ حقائق میں سے ہے اور توضیحات قرآنی کی رو سے اس کی تشریح یہ

ہے کہ اسرافیل علیہ السلام ملائکہ مقربین میں سے ایک سربرآوردہ فرشتہ ہے جو بارگاہِ خداوندی سے اس فرض کی ادائیگی پر مامور ہو چکا ہے کہ جب دنیا اختتام کے دروازہ پر پہنچ جائیگی تو اُسے خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ نفیری بجانے کا حکم دیا جائے گا۔ جسے وہ اپنے ہاتھ میں لئے ہر وقت ارشادِ ربانی کا منتظر ہے۔ اس فرشتہ کی ڈیوٹی یہ ہے کہ حکم سنتے ہی فی الفور وہ نفیری بجائے اس نفیری کی آواز کائنات عالم کے لئے فنا کا پیغام ہوگی جس کے پیدا ہوتے ہی دنیا کی ہر شے موت کی نیند سو جائے گی، فلک بوس پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ انسانی ہنگاموں سے لبریز آبادیاں سکوتِ مرگ میں بدل جائیں گی اور موجوداتِ عالم کا ذرہ ذرہ نیست ونابود ہو جائیگا غرض کہ اس نفیری کی آواز فنا کا ایسا ہمہ گیر متلاطم پیدا ہوگی جس سے زندگی کی حرارت ابدالآباد معدوم ہو جائے گی۔

پس شاعر کے تخیل نے احساسِ خودی کو عشق سے محکم کرنے کا نتیجہ یہ بیان کیا ہے کہ جس طرح اسرافیل کی نفیری اپنی زبان سے آواز نکلتے ہی تمام دنیا پر غالب آجائے گی، جن وانس، شجر و حجر ہر چیز پر چھا جائے گی، اسی طرح عشق سے مضبوط و منظم کی ہوئی خودی بھی اعتمادی بھی سب اشیاء پر غالب آجائے گی اور اس لحاظ سے اُسے صورِ اسرائیل کا مرتبہ حاصل ہو گا۔ کیونکہ مادی و روحانی تمام طاقتیں اس کے زیرِ اقتدار آجائیں گی۔

اک شرحِ مسلمانی اک جذبِ مسلمانی
ہے جذبِ مسلمانی سرِّ فلک الافلاک

مسلمانی کا وجود دو مظاہر میں جلوہ گر ہے۔ ایک مظہر اسکی ظاہری حالت کا مرقع ہے جسے شرع کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے دوسرا مظہر مسلمانی

کی باطنی کیفیات کا حامل ہے اور اس کو جذب سے موسوم کیا گیا ہے۔ شرع اور جذب میں معنوی اعتبار سے یہ فرق ہے کہ شرع سے مراد مسلمانی کا وہ علم ہے جو اصول و قواعد اور ضابطہ و نظام کی شکل میں صحائف دینی کے اوراق پر موقوم ہے اور جس کو اسلامی اعمال و اعتقاد کے لئے ایک لائحہ اور ایک پروگرام کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس علم میں مسلمانی کے قیام و تعمیر کے بنیادی خطوط، نیکی اور بدی کی جزا و سزا کے معیار اور ایمان و عمل کے نتائج و عواقب کی حقیقتوں پر بحث کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانی کی ظاہری صورت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کن چیزوں پر کاربند ہونا اُن کو ہر حالت میں مدنظر رکھنا ضروری ہے اور کن اعمال و افعال سے احتراز کرنا، ان سے بہر صورت بچنا لازم ہے۔

جذب مسلمانی سے مقصود وہ ذوق عشق ہے جو ایمان و یقین کی مائل کیفیات کے ساتھ روح انسانی میں سرایت کر جاتا ہے۔ یہ علم کتب صحائف کی قیود سے قطعی طور پر بے نیاز اور مسلمانی کے باطنی حقائق کا معلم ہے۔ یہ اپنے تاثرات کو اندر ہی اندر انسان کے سینہ میں محفوظ کر دیتا ہے اور اس کی تعلیم خیالات و الفاظ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ ذوق و شوق سے سبق حاصل کرتی ہے۔ اس کی ہدایات ذہن انسانی پر الفاظ کی صورت میں نقش نہیں ہوتیں بلکہ غیر مرئی طور پر اس کے رگ و ریشہ میں سما جاتی ہیں چنانچہ اسی انجذابی کیفیت کا نتیجہ ہے کہ انسان معارفِ اسلام کا علم کچھ پڑھے لکھے بغیر یہاں تک حاصل کر لیتا ہے کہ جہاں تک مذاکرات مسلمانی کے تمام اوراق و صحائف پر عبور رکھنے والے کا دماغ رسائی ہی نہیں رکھتا۔ اس لحاظ سے جذب کی حاقت مسلمانی کے باطنی حقائق کی محرم ہے۔

ان توضیحات کی رو سے متذکرہ صدر شعر کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ظاہری اور باطنی، ظاہری صورت کا نام شرع ہے۔ اور باطنی صورت کا نام جذب ہے۔ اور ان دونوں صورتوں کا امتیازی فرق یہ ہے کہ ظاہری صورت یعنی شرع، مسلمانی کے ظواہر کو واضح کرتی ہے۔ مگر دوسری صورت باطنی یعنی جذب چونکہ ذوق عشق کی مظہر ہے، اس لئے وہ فلک الافلاک کے اسرار کو روشن کرتی ہے، یعنی جو مسلمانی جذب عشق کی حامل ہے، وہ اس کیفیت کے طفیل سے کائنات سماوی کے رازوں سے بھی پوری طرح آگاہی رکھتی ہے اور اس سے عالم افلاک کا کوئی اسرار بھی مخفی نہیں ہوتا۔

اے رہرو فرزانہ بے جذب مسلمانی،
نے راہ عمل پیدا نے شاخ یقیں نمناک

جذب مسلمانی کے رتبۂ بلند کو واضح کرنے کے بعد شاعر سالک راہ کو ہدایت کرتا ہے کہ اے عقلمند راہرو، اے ہشیار راہگیر اگر تو حقیقت کی منزل مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے تو اس کے لئے جذب عشق کا ہونا ناگزیر ہے کہ یہی وہ خضر راہ ہے جو تجھے مقام مقصود تک پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اگر تیری مسلمانی میں جذب عشق کی کیفیت موجود نہیں تو پھر تو بھٹک گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ تجھے عمل کا راستہ مل سکتا ہے اور نہ تیرے یقین کی ٹہنی میں زندگی کی نمی پیدا ہو گی۔ راہ عمل پیدا کرنے والا جو ہر بھی یہی ہے اور شاخ یقین میں زندگی کی رطوبت پیدا کرنے کا حقیقی ذریعہ بھی یہی ہے اس کے بغیر تیری جستجو، تیری محنت بے سود ہے جو کسی نتیجہ پر نہیں لے جا سکتی اور نہ شاہد مراد تک لا سکتی ہے۔ لہذا تجھے راز حقیقت پانے کے لئے جذب

عشق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ مسلمانی کی روح حیات وراصل
اسی سے وابستہ ہے۔ یہ نہ ہو تو مسلمان کی ہستی ایک مردہ لاش کی مانند ہے ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس شعر میں مسلمانوں کی موجودہ بے حسی کی وجہ ایک لطیف طنز کی صورت
میں ذوقِ عشق سے محرومی بیان کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں، کس قدر اندھیر
کی بات ہے یعنی اندھیر گردی کا کتنا افسوسناک عالم ہے کہ مسلمانوں میں عشق
کی آگ بجھ گئی ہے اور وہ راکھ کا ایک ڈھیر بنے ہوئے ہیں۔ عشق کی
آگ سے دنیا میں روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر جب سے وہ بجھ گئی ہے، چاروں
طرف اندھیرا چھا گیا ہے اور مسلمان جن کے سینے اس آگ کی حرارت اور
روشنی سے زندہ اور روشن تھے، اب خاکستر کے ڈھیر بن کر رہ گئے ہیں اس
توجیہہ سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا کہ مسلمان عشق ہی کی بدولت صحیح معنوں میں
زندہ تصور کیا جا سکتا ہے اور اگر اس میں سے عشق، کی آگ بجھ جائے
تو پھر وہ گویا ایک بے جان شے، ایک راکھ کے ڈھیر کے مشابہ ہے۔
چنانچہ مسلمانوں کی موجودہ پستی اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ ان میں آتشِ عشق
بجھ گئی ہے اور وہ ہر میدان میں، ہر معرکہ میں اور ہر کام میں ذلت و ناکامی کا
شکار ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی آگ کے شعلوں سے دنیا روشن
تھی مگر ان کے بجھنے سے زمانے میں کفر و معصیت کی تاریکی پھیل گئی ہے مسلمان
اگر یہ آگ بجھنے نہ دیتے تو نہ وہ اس حالت کو پہنچتے اور نہ دنیا میں اندھیر
پیدا ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مسلمان کی ہستی عشق ہی سے زندگی اور
کمال کے درجہ تک پہنچتی ہے ورنہ بالکل بے حقیقت ہے خواہ علم و دانش

کے کسی مرتبہ تک پہنچ جائے۔

یہ جواہر اگر کارفرما نہیں ہے،
تو ہے علم و حکمت فقط شیشہ بازی،

اگر جوہر عشق کارفرما نہ ہو تو علم و حکمت کی حقیقت شیشہ بازی سے زیادہ کچھ نہیں۔ یعنی علم و حکمت بھی تاثیر محبت کے بغیر محض شیشوں سے کھیلنے کا نام ہے۔ جس طرح بچے کھلونوں سے کھیل کر دل بہلاتے ہیں اور ان کا کھیل بذات خود کوئی اصلیت نہیں رکھتا بلکہ محض تفریح طبع کا سامان ہوتا ہے۔ اسی طرح اثر عشق کے بغیر عالم اور حکیم شیشے کے آلات بنا بنا کر ان سے دل بہلاتے ہیں اور یہ کام کسی حقیقی نتیجہ پر محمول نہیں ہوتا۔ حقیقی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے جوہر عشق کا کارفرما ہونا ناگزیر ہے کیونکہ یہی دنیا و عقبیٰ کی نعمتوں کو حاصل کرنے کا اصل ذریعہ ہے۔

یقیں محکم عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مضبوط یقین، لگاتار عمل اور جہاں کو فتح کرنے والی محبت۔ یہ چیزیں زندگی کی جنگ میں مردوں کی شمشیریں ہیں۔ یعنی جدوجہد حیات میں اگر مرد کے پاس یہ تین چیزیں موجود ہوں تو وہ سارے عالم کی فتح و نصرت اور سرفرازی و اقبالمندی حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر شے بجائے خود اتنی بڑی طاقت ہے جو دنیا بھر پر غالب آنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ مثلاً یقین انسانی کہ اگر اس میں ایک مضبوط استقامت ہو اور ایسا اٹل استحکام کہ داخلی و خارجی کوئی تحریک بھی اسے متزلزل نہ کر سکے تو وہ ہر بڑی سے بڑی پستی کو بلندی میں اور ہر بلندی کو پستی میں تبدیل کر سکتا ہے، وہ یہ امکان رکھتا ہے کہ

آسمان پر سے ستاروں کو نوچ لائے، مہر و ماہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور زمین کو اس بام رفعت تک پہنچا دے جس کو دیکھ کر عالم بالا کے رہنے والے دریائے حیرت میں ڈوب جائیں چنانچہ اس کا ثبوت خود حضرت علامہ ہی کی زبان سے سنئے :-

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقین -
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

خدا کے بندے کا یقین حق و صداقت کی پرکار کا مرکز ہے اور حقیقت کے تمام کام اسی نقطہ کا سہارا لے کر چاروں طرف گھومتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو جس طرح کسی مرکز کے بغیر پرکار دائرہ نہیں کھینچ سکتی اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔ اسی طرح حق کی پرکار بھی نقطۂ یقین کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی اور کسی کام کو بھی سر انجام نہیں دے سکتی۔ یہ اسی مرکز کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے ہر گوشہ میں پرکار حق کی دسترس ہے اور وہ اپنی عملی کوششوں میں حسب منشا کامیابی حاصل کرتی ہے۔ چنانچہ مرد خدا کا یقین چونکہ پرکار حق کا مرکز ہے اس لئے وہ حقائق صادقہ کی ایک لازوال حیثیت رکھتا ہے مگر اس کے علاوہ باقی تمام عالم ایک وہم، ایک طلسم اور ایک بناوٹ کے مترادف ہے یعنی اس نقطہ کے سوا دوسری دنیا تو ہمات سحر کاری اور تصنعات کے ایک چھوٹے سلسلہ کا نام ہے۔ غور فرمائیے کہ اک یقین کے نہ ہونے سے دنیا کتنے بڑے ملزم کی حیثیت اختیار کر گئی ہے؟ اور پھر ان الزامات سے بری کرنا بھی اسی یقین کا کام ہے۔ یہاں مرد خدا کی تخصیص اسی استحکام کو ظاہر کرنے کی غرض سے کی گئی ہے جو یقین کی تکمیل کے لئے لازم ہے کیونکہ یقین محکم کی حالت مردان خدا ہی کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہی اس جوہر سے متصف ہیں۔

یہ تو تھی یقینِ محکم کی تعریف! اب عملِ پیہم کی حیثیت دیکھئے :۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

انسان کی زندگی عمل سے بنتی ہے خواہ وہ اسے جنت کی مانند عیش وراحت اور سکون و آسائش کی حامل بنالے اور خواہ اذیت واضطراب اور رنج ومصائب سے دوزخ کی شکل میں تبدیل کرلے۔ اگر انسان منشائے الٰہی کے مطابق اچھے عمل کرے گا تو اس کی زندگی جنت کی مستحق ہو جائیگی اور اگر رضائے خداوندی کے برخلاف بداعمالی سے کام لے گا تو اس کی زندگی جہنم کی حقدار بن جائیگی۔ یہ دونوں صورتیں بہرحال انسان کے عمل کا نتیجہ ہیں ورنہ یہ خاک کا پتلا نہ نور سے پیدا ہوا ہے کہ اس کی زندگی لامحالہ جنت کے نوری مقام کی حامل تصور کی جائے اور نہ آگ سے بنا ہے کہ اُس کی زندگی جہنم کے ناری مقام کی حقدار سمجھی جائے۔ وہ زندگی کو اپنے عمل سے خود بناتا ہے چاہے جنت بنالے اور چاہے دوزخ بنالے۔

یہ عملِ پیہم کا مقام ہے کہ وہ حیاتِ انسانی کی اپنی نوعیت کے مطابق تشکیل کرتا ہے اور محبت وہ جوہر کامل ہے جو سارے عالم کو فتح کرنے کی طاقت رکھتی ہے اور انسان کو حقیقت ومعرفت کے اسرار سے آگاہ کر کے اُسے ارض وسما کو تسخیر کرنے والی استعداد عطا کرتی ہے۔ ان توضیحات سے ثابت ہوا کہ یقینِ محکم عملِ مسلسل اور محبت کا فاتح عالم جوہر تینوں چیزیں بہت بڑی طاقتیں ہیں اور مردوں کے لئے زندگی کی کشمکش میں ایسی شمشیروں کی حیثیت رکھتی ہیں جو مقصودِ حقیقی کی راہ کے تمام مصائب اور رکاوٹوں کا قلع قمع کر دیتی ہیں۔ مردانِ حق کے یہی وہ ہتھیار ہیں جو انہیں منزلِ مقصود تک کامیابی سے لے جا سکتے

ہیں۔ اگر انسان کے دل میں ایک مضبوط یقین کی کیفیت ہر وقت موجزن رہے اور اس کا اعتماد قلب ایسا نہ ہو کہ ایک چیز کو مان لینے کے بعد تھوڑی دیر میں اس سے انکار کر دے بلکہ کسی حالت اور کسی وجہ پر بھی اس کی استقامت میں فرق نہ آسکے پھر عمل کا سلسلہ بھی کسی رکاوٹ کی بنا پر ٹوٹنے نہ پائے اور محبت کے تاثرات سے بھی روح ہر لمحہ لبریز رہے تو یہ حالتیں انسان کی زندگی کی جنگ میں تلواروں کے برابر ہیں اور ان سے وہ عالم ہستی کے تمام گوشوں اور تمام قوا و اشیاء پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے اور انہیں نہایت کامیابی کے ساتھ فتح کر سکتا ہے۔

<u>عارفانہ مکالمہ</u> مباحث عقل و عشق کو اختتام تک پہنچانے کے لئے آخر میں اُس عارفانہ مکالمہ کی تشریح بھی نہایت ضروری ہے جو علامہ اقبالؒ اور اُن کے رہنمائے حقیقت حضرت مولانا رومی علیہ الرحمتہ کے درمیان باطنی طور پر پیش آیا کیونکہ اُس مکالمہ میں مراتب عقل و عشق کا امتیاز مولانا کے ممدوح ایسے عارفِ کامل کی زبان معارف ترجمان سے فیصلہ کن طریقہ پر بیان کیا گیا ہے۔

منزل حقیقت کی راہ میں عقل کے عجز و نارسائی سے مایوس ہو کر علامہ اقبالؒ ایک گم کردہ راہ مسافر کی طرح بھٹک جاتے ہیں اور یہ احساس انہیں دریائے حیرت میں ڈبو دیتا ہے کہ علم و دانش کے انتہائی کمال سے بھی وہ درِ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ قریب تھا کہ یہ سراسیمگی اور عقل کی رہنمائی انہیں جادۂ حقیقت سے منحرف کر کے کسی تاریک مقام پر لے جاتی اور اپنی عیاریوں سے انہیں ذوق جستجو سے بھی محروم کر دیتی کہ عین اس وقت مولائے روم کا فیض روحانی باطن میں آپ کی طرف متوجہ ہوا جسے دیکھ کر آپ بے اختیار قدموں میں گر پڑے اور عرض کی۔

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خون،
علمِ حاضر سے ہے دین زار و زبون

دیکھنے والی آنکھ سے یعنی ہوشمند آنکھ سے خون کی ندی جاری ہے کہ موجودہ علم نے دین و مذہب کو کس قدر ذلیل و خوار کر دیا ہے، کبھی وہ اپنے کمالات کے غرور میں خدا کی ہستی کا یقین نہیں کرتا، کبھی نبی کریمؐ کے عرش عظیم پر جانے کے واقعہ کو ناقابل تسلیم قرار دیتا ہے، کبھی روزِ جزا کی حقیقت کو توہمات سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی توحید باری سے انکار کر دیتا ہے غرضیکہ اپنی غلط اور مہمل نکتہ طرازیوں سے دین کے مسلمات کو قدم قدم پر جھٹلانے کی کوشش کرتا ہے اور حقائق پر نظر رکھنے والی آنکھ علم کی اس گمراہی اور نادانی پر خون کی ندیاں بہا رہی ہے جس سے علم اپنی تمام طاقتیں دین کو زار و زبون کرنے پر صرف کر رہا ہے۔ چشمِ بینا سے ہماری یہ آنکھ مراد نہیں جو ماحول میں بکھری ہوئی اشیا کو دیکھتی ہے بلکہ وہ آنکھ مقصود ہے جو عالمِ قدرت کے جمالِ معنوی کی صداقتوں کو دیکھنے کی قابلیت رکھتی ہے اور دین کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بھی وہی آنکھ بہا سکتی ہے جو اس ذلت کے خطرناک نتائج کو حقیقی شکل میں دیکھ سکے۔

اس تاویل سے علامہ کا مقصود مولانا رومؒ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ آخر علم کی یہ حیثیت کیوں ہے کہ وہ دین کو خوار کرنے ہی میں اپنی بڑائی تصور کرتا ہے اور سالکانِ راہ کو بھٹکا دیتا ہے؟ پیرِ رومیؒ اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:-

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

علم کو اگر تو صرف وجود پہ ڈال دے تو یہ ایک سانپ کی مانند ہوتا ہے جو اپنے زہر یلے اثر سے تجھے ہلاکت کی طرف لے جائے گا۔ اور اگر علم کو دل میں بٹھالے تو وہ تیرا دوست ہو گا جو ہمیشہ تجھے نقصان سے محفوظ رکھیگا اور فائدہ کے حصول میں تیری اعانت کرے گا۔ علم کو وجود پہ ڈال لینے کا مطلب یہ ہے کہ اُسے سوچے سمجھے اور اس کی حقیقت پہ غور کئے بغیر صرف سینہ میں جمع کر لیا جائے جس طرح کتابوں کا انبار گدھے پہ لاد دیا گیا ہو تو اس صورت میں یہ سانپ کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر اُسے دل کی گہرائیوں میں رکھا جائے اور اس کو سوچ سمجھ کر اس کے اثرات و نتائج پہ غور کیا جائے تو پھر وہ ایک دوست کے مترادف ہے۔ چنانچہ دین کو ذلیل و رسوا کرنے والا وہی علم ہے جس کا ذخیرہ انسان کے وجود پہ بار کر دیا گیا ہو اور یہ اپنے زہر سے دین و مذہب کو نقصان پہنچانے ہی میں بڑائی تصور کرے گا۔ کیونکہ وہ ایک سانپ ہے اس لئے اس سے بھلائی کی توقع رکھنا فضول ہے۔ لیکن اگر اس علم کو دل سے حاصل کیا جائے تو اس سے کسی قسم کے نقصان کا احتمال نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوست کی حیثیت رکھتا ہے جو اگر فائدہ نہیں پہنچا سکتا تو نقصان بھی نہیں دے گا۔ اس کا بعد علامہ اقبالؒ اپنی محرومی کی داستان سنا کر صحیح راہ عمل کا استفسار کرتے ہیں:۔

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

میں نے مشرق اور مغرب کے تمام علوم پڑھ لئے ہیں مگر میری روح میں درد و اضطراب کی کیفیت اب بھی باقی ہے۔ میرا خیال تھا اور مادی علوم میرے روحانی درد کا مداوا ہوں گے اور اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر میں نے

انہیں کمال محنت اور جانفشانی سے حاصل کیا مگر حصول کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ دفتر بے معنی تھا میرے مرض کا علاج نہ تھا اور میری روح جس رازِ حقیقت تک پہنچنے کو بیتاب تھی علوم کا ذخیرہ اس کے متعلق کچھ واقفیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ میں جہاں پہلے تھا، وہیں اب ہوں۔ میری جستجو ایک ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوئی کیونکہ علوم پڑھ کر بھی میں منزلِ مقصود کو نہیں پا سکا اور اس محرومی و ناکامی کا احساس میری روح میں درد و کرب کی ایک جانگداز کیفیت بن گیا ہے میں چاہتا تھا کہ ان علوم کی مدد سے اپنے روحانی اضطراب کو دور کروں مگر چونکہ اس مقصد تک رسائی علم و حکمت کے امکان میں نہ تھی اس لیئے مجھے کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور میرا روحانی درد اب بھی باقی ہے حالانکہ میں نے دنیا بھر کے علوم پڑھ لیئے ہیں۔ آخر میں اس درد و کرب کا کیا تدارک کروں؟ پیر رومیؒ فرماتے ہیں سے

دستِ ہر نااہل بیمارت کُند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کُند

جس طرح حصول علم نے تیرے درد کی دوا نہیں کی بلکہ رنج ناکامی کا اضافہ کر کے تیرے روحانی مرض کو اور بھی بڑھا دیا ہے، اسی طرح ہر نااہل کا ہاتھ تجھے زیادہ بیمار کرے گا۔ کیونکہ وہ علاج کرنے کا تو شعور نہیں رکھتا اور اس حالت میں اُس کی حکمت اس کے سوا اور کیا نتیجہ پیدا کر سکتی ہے کہ تجھے تندرست کرنے کی بجائے زیادہ بیمار کر دے؟ اس لیئے اگر تو صحت یاب ہونا چاہتا ہے تو ہماری طرف آ تاکہ تیری چارہ سازی کریں۔ اس شعر سے علم و دانش کی نااہلی اور نادانی پورے طور پر روشنی میں آگئی ہے اور یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ علوم مادی ایک سالکِ راہ کو معرفت

الٰہی اور منزلِ حقیقی تک پہنچانے کی اہلیت بالکل نہیں رکھتے اور اس بنا پر وہ ایک عاشقِ صادق کی روحانی بیماری کو دور نہیں کر سکتے چنانچہ مولینا رومیؒ علامہ اقبالؒ کو مطلع فرماتے ہیں کہ اگرچہ تو نے مشرق و مغرب کے علوم پڑھ لئے ہیں مگر یہ تیرے درد کا درماں نہیں ہو سکتے کیونکہ ان میں وہ جوہر موجود ہی نہیں جو تیرے روحانی مرض کا علاج کر سکے۔ اس لئے ان کا خیال چھوڑ دے، وہ تجھے اور بھی زیادہ بیمار کر دیں گے اور ہماری طرف آ یعنی ایک اہلِ معرفت کی خدمت میں حاضر ہو تا کہ تیری بیماری کا علاج ہو اور تو منزلِ مقصود تک پہنچ کر صحت یاب ہو سکے۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ حضرت مولانا سے اُن پُر اسرار مسائل کا حل دریافت کرتے ہیں جسے ان کا فہم و ادراک سمجھنے سے قاصر تھا اور جو حصول علم کے بعد بھی ان کے ذہن نشین نہ ہو سکے تھے۔ عرض کرتے ہیں ؎

سرّ آدم سے مجھے آگاہ کر
خاک کے ذرے کو مہر و ماہ کر

مجھے آدم کے راز سے آگاہ فرمائیے! مجھے یہ بتائیے کہ اس خاک کے پتلے کی جسے آدم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، حقیقت کیا ہے؟ میں نے علوم کے خزانہ میں تو اس معمہ کا حل نہیں پایا، اب آپ مجھے آدم کے اسرار سے آگاہ کیجئے کہ اس بسر لئے فانی ہیں یہ کس درجہ اور کس حیثیت کا مالک ہے؟ یہ بتانا آپ کا اتنا بڑا کرم ہوگا جو مجھ ایسے خاک کے ذرے کو سورج اور چاند کے برابر رتبہ بخش دے گا۔ اس لئے آپ مجھے سرِ آدم سے آشنا کر کے مہر و ماہ کا ہمسر بنا دیجئے۔ پیر رومیؒ فرماتے ہیں ؎

ظاہرش را پشۂ آرد بچرخ
باطنش آمد محیط ہفت چرخ

آدم کائنات کا سب سے بڑا راز ہے اور اس کا ظاہر تو ایسا ہے کہ ایک معمولی مچھر کا دانہ بھی اسے چکرا دینے کے لئے کافی ہے جیسا کہ نمرود کو ایک مچھر نے ہلاک کر دیا تھا یعنی بظاہر وہ اتنا کمزور ہے کہ چھوٹا سا کیڑا مچھر بھی اس پہ غالب آ سکتا ہے مگر حقیقت میں وہ اسقدر بلند اور بڑا ہے کہ اُس کی ہستی سات آسمانوں پہ احاطہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے یعنی اُس کا باطن ایسی قوتوں کا حامل ہے جو سات آسمانوں پہ حاوی ہو سکتی ہیں اور وہ ان کی مدد سے ارض و سما اور عرش و فرش پہ قبضہ کر سکتا ہے۔ علامہ پھر پوچھتے ہیں ؎

خاک تیرے نور سے روشن بصر
غایت آدم خبر ہے یا نظر؟

آپ چونکہ عرفان حقیقت میں درجۂ کمال تک پہنچے ہوئے ہیں اور عشق خداوندی کی محویت نے آپ کو عارف کامل کی حیثیت عطا کی ہے اس لئے آپ کی ذات ایک ایسے نور سے لبریز ہے جو مٹی کو بصیرت کی روشنی بخشتا ہے یعنی آپ کی رہنمائی کا نور اپنے اندر وہ جوہر رکھتا ہے جس سے ناچیز خاک کے بے حس و حرکت پتلے کی آنکھیں بھی بینائی کی روشنی حاصل کر لیتی ہیں اور وہ اس روشنی کی بدولت منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ جب کہ اتنا جلیل القدر مرتبہ رکھتے ہیں کہ آپ کا نور مٹی کی چشم بصیرت کو بھی منور کر دیتا ہے تو مجھے بتائیے کہ آدم کی غرض و غایت خبر ہے یا نظر، اس کی ہستی کا اصل مقصد احوال عالم کا علم حاصل کرنا اور دنیا کے حوادث و افکار کی خبر بہم پہنچاتا ہے یا جمال فطرت کے نظری مطالعہ سے کسی اور باطنی نتیجہ تک پہنچنا یعنی

آدم کی ضرورت خبر و دانش کے حصول کے لئے تھی یا نگاہِ عشق کی احتیاج کی بنا پہ تھی؟ پیر رومی جواب دیتے ہیں: ؎

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

آدمی کی اصل روح دید ہے اور باقی سب پوست (چھوگ) یعنی ہڈیوں اور چمڑے کا ڈھانچہ ہے۔ اگر دید کا جوہر نہیں ہے تو آدمی کی حیثیت بالکل ایک چمڑے کے ڈھانچے کے برابر ہے کیونکہ اس کی زندگی کی اصل روح دید ہی کا وجود ہے اس کے بغیر آدمی کچھ حقیقت نہیں رکھتا، ایک ناکارہ پوست ہے جو کسی کام نہیں آ سکتا۔ مگر اس دید سے مراد وہ نظر نہیں جو دنیا کی ہر اچھی بُری چیز کو ہمارے سامنے لاتی ہے بلکہ وہ خاص نظر عشق جو دوست کو دیکھتی ہے۔ آدمیت کا اصل جوہر دوست کی دید ہے یعنی محبت اور محبت کی نظر۔ یہ وہ دید ہے جو قلب انسانی میں جذبۂ عشق تخلیق کرتی ہے اس لئے ہستیٔ آدم کا معنوی راز اسی سے وابستہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اس مشتِ خاک کو خلعت آدمیت سے سرفراز کرتی ہے۔ اس کے بغیر انسان بالکل پوست کے برابر ہے۔ اس لئے آدم کی غایت نظر ہے خبر نہیں اور نظر بھی وہ جو دوست کو دیکھتی ہے یعنی عشق و محبت کی نظر! کیونکہ انسان کو مقصود حقیقی تک پہنچانا اسی کا کام ہے، خبر اس سے عاجز ہے۔

اس کے بعد علامہ اقبال منزل مقصود تک جانے کے لئے صحیح راہ عمل کا استفسار کرتے ہیں ؎

گرچہ بے رونق ہے بازارِ وجود
کون سے سودے میں ہے مردوں کا سود

اگرچہ وجودِ انسانی کا بازار بالکل بے رونق ہے اور اس میں حقیقت کی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ یعنی اس تہذیبِ نو کے زمانہ میں جبکہ خلوص و محبت اور ایمان و اعتقاد کی جگہ فتنہ و فریب اور عیاری و مکاری کی حکومت ہے، کسی شخص کے دل میں بھی حقیقی عشق و محبت کی تلاش اور جذبۂ خریداری باقی نہیں اس لئے انسانی وجود کے بازار میں کوئی رونق نہیں رہی اور وہ خریدار دل کے نہ ہونے کی وجہ سے بالکل سونا پڑا ہے عالمِ وجود میں یہ ہمت ہی نہیں رہی کہ وہ خرید و فروخت سے اپنے بازار میں رونق کر سکے۔ پھر اس حالت میں مردوں کے لئے کونسا سودا فائدہ مند ہو سکتا ہے جو ان کے بازارِ وجود میں رونق پیدا کرے اور انہیں مقصد تک لے جائے؟ وجود کے بازار کی اس بے رونقی کے عالم میں کس چیز کی خرید اور کس چیز کی فروخت اہلِ عزم و طلب انسانوں کے لئے سودمند ہوگی؟
پیر رومی ارشاد فرماتے ہیں ؎

زیر کی بفروش و حیرانی بخر
زیر کی ظن است و حیرانی نظر

اگر تو بازارِ وجود میں رونق دیکھنا چاہتا ہے اور رازِ حقیقت کی خبر حاصل کرنے کا آرزومند ہے تو عقلمندی کو بیچ اور حیرانی کو خریدے۔ بس یہی وہ سودا ہے جس میں مردوں کے لئے فائدہ ہے۔ عقلمندی کو بیچنے اور حیرانی کو خریدنے کا مطلب یہ ہے کہ علومِ دنیا کے حصول سے جو دانائی تو نے حاصل کی ہے اس کا خیال چھوڑ دے اور وہ حیرانی خرید جو دید جلوہ سے

پیدا ہوتی ہے یعنی حیرت نظارہ۔ کیونکہ وہ دانائی تیرے دل میں شک و شبہ اور ظن و گمان کی پرورش کرتی ہے اور یہ حیرانی تیری نظر کو جلوہ سے لبریز رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اہل خرد ہر بات کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی اصل و حقیقت اور اثر و نتیجہ کی فضول بحثوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں لیکن مست نظارہ لوگ اپنے لطف و سرور کی حیرانی میں ڈوبے رہتے ہیں اس لئے مولائے روم ہدایت فرماتے ہیں کہ اس عقل و دانش کا سہارا چھوڑ دے اور نظارہ کی حیرانی حاصل کر۔ پھر تو منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ علامہ پوچھتے ہیں ؎

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ؟
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

علم و حکمت کا سراغ کیونکر مل سکتا ہے؟ یعنی جس مقصد کو حاصل کرنے کی مجھے خواہش ہے، وہ علم و حکمت کو کس انتہائی سے جاننے سے ملیگا اور اس علم و حکمت کی انتہا کا سراغ کیونکر نکالا جائے۔ جس سے سوز محبت، درد عشق اور داغ فراق ہاتھ آجائے؟ مجھے انہی چیزوں کی تلاش ہے اور ان کو حاصل کرنے والے علم و حکمت کو کس پتہ سے ڈھونڈا جائے؟ پیر رومی جواب دیتے ہیں ؎

علم و حکمت زاید از نان حلال
عشق و رقت آید از نان حلال

وہ علم و حکمت ذوق حلال سے پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے اور عشق و رقت بھی رزق حلال ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ علم و حکمت اور عشق اور رقت کے حصول کا اصل ذریعہ وہ رزق ہے جو جائز اور حلال طریقہ سے پیدا

کیا گیا ہو، اس کے بغیر ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہو سکتی ہے اور اگر ہو بھی جائے تو وہ کسی نتیجہ پر پہنچانے کے قابل نہیں ہوتی - اس لئے علم و حکمت اور عشق و محبت کی حقیقی بنیاد رزق حلال ہے جس سے ان چیزوں کا سراغ مل سکتا ہے ۔

یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد مرید ہندی سوال کرتے ہیں:۔

آسمان میں راہ کرتی ہے خودی
صید مہر و ماہ کرتی ہے خودی
بے حضور و با فروغ و بے فراغ،
اپنے نخچیروں کے ہاتھوں داغ داغ،

خودی جو اتنی بڑی قوت ہے کہ آسمان میں راستہ پیدا کر لیتی ہے اور مہر و ماہ کو شکار کرنے کی طاقت رکھتی ہے ایسی عظیم الشان حقیقت ہونے کے باوجود بھی اپنے ہی تیروں سے داغ داغ کیوں ہے؟ حالانکہ وہ بہت ہی بڑے مرتبہ کی حامل ہے۔ جو شے آسمانوں میں راہ پیدا کرنے اور سورج اور چاند کو شکار کرنے کی طاقت رکھتی ہے، وہ کامیابی کے درجہ تک کیوں نہیں پہنچتی؟ اس شان بلند کے باوجود اس کی مقصد کے حصول سے ناکامی حد سے زیادہ حیرت انگیز کیوں ہے؟ پیر رومیؒ فرماتے ہیں:۔

آں کہ ارزد صید را عشق است و بس
لیکن او کے گنجد اندر دام کس

یہ ٹھیک ہے کہ خودی مہر و ماہ کو شکار کرتی ہے لیکن اصل چیز جو شکار کرنے کے لائق ہے، وہ عشق ہے اور بس! مہر و ماہ کا شکار کرنا منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا، منزلِ مقصود تک لے جانے والا صرف

عشق کا شکار ہے۔ خودی اگر مہر و ماہ کی بجائے عشق کا شکار کرتی تو اپنے تیر دل سے داغ داغ نہ ہوتی بلکہ اُس حقیقتِ صادقہ تک نہایت کامیابی سے پہنچ جاتی جو اصل مقصد تھی۔ اور اب یہ ناکامی صرف اسی باعث ہے کہ خودی نے عشق کو شکار نہیں کیا یعنی خودی کی تعمیر عشق کی بنیاد پہ نہیں ہوئی۔ اور شکار کرنے کی اصل چیز تو عشق ہے لیکن وہ کسی کے دام میں کب سماتا ہے؟ یعنی عشق اس قدر عظیم الشان چیز ہے کہ کسی کے دام میں اُس کے سمانے کی گنجائش ہی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ خودی اس کو شکار نہیں کر سکی اس نے اپنی تمام قوت سورج اور چاند کو شکار کرنے اور آسمان میں راستہ پیدا کرنے پہ صرف کر دی جو بالکل بے فائدہ کام تھا۔

اس تمام گفتگو سے یہ امر نہایت واضح طور پہ روشن ہو گیا کہ عالم حیات کی اصل روح عشق ہے اور یہی وہ جوہر ہے جو انسان کو عرفان الٰہی کے اونچے مراتب تک پہنچا سکتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی چیز یہ کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ عقل و دانش بجائے خود ایک حیرانی ہے جو انسان کو کسی صحیح نتیجہ پہ لے جاتے کی بجائے اُسے اپنے کمالات کی نیرنگیوں میں بھٹکا دیتی ہیں۔ اسی بنا پہ علامہؒ فرماتے ہیں ؎

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

مکتبہ عنایت اللہ

پاکستانی بچوں کی صحیح نشوونما اور روشن مستقبل کی حقیقی ضامن
ہر دلعزیز لائبریری کتب
منظور شدہ برائے سکول لائبریری بموجب چٹھی نمبر ۲۸ مجریہ ۳ دسمبر ۱۹۵۸ء منجانب پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس
تاریخی کتب
طارق
سالار مسعود غازی
سلطان محمود غزنوی
سلطان صلاح الدین ایوبی
محمد بن قاسم
اردو کتب
تدبیر کا کھیل
اونٹ کا انتقام
سانپ کی تلاش
پتھر کی آنکھ
ننگڑا شہزادہ
بگلا بھگت
نیلم پری
سنہری جزیرہ
کالا شہزادہ
ہاتھی کی چوری حصہ اول
جوتی چور
گدھے کی آپ بیتی حصہ اول
گدھے کی آپ بیتی حصہ دوم
بہادر لڑکی
نولکھا باغ
جنت کی سیر
اخلاقی کہانیاں
گنجینۂ اخلاق حصہ اول مصنفہ پیر غلام دستگیر صاحب نامی
گنجینۂ اخلاق حصہ دوم مصنفہ پیر غلام دستگیر صاحب نامی
تاریخی کہانیاں
راہ نما حصہ اول مصنفہ محمد حسین بی اے بی ٹی
راہ نما حصہ دوم مصنفہ محمد حسین بی اے بی ٹی
ناشران مکتبہ دین و دنیا (رجسٹرڈ) ۳۱۸ شاد باغ لاہور